کلمہ حق

رئیس التحریر

عصر حاضر کے چیلنجز اور ہماری ذمہ داریاں

۲۰ تا ۲۲/ اگست ۲۰۰۳ء کو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے گراؤنڈ میں جمعیۃ طلبہ عربیہ پاکستان کے زیر اہتمام دینی مدارس کے طلبہ کا کل پاکستان اجتماع عام ہوا جس میں تمام مکاتب فکر کی طلبہ تنظیموں کے راہ نماؤں، ملک بھر سے ہزاروں طلبہ اور مختلف دینی جماعتوں کے قائدین نے خطاب کیا۔ اجتماع عام کی ایک نشست ''عصر حاضر کے چیلنجز اور ہماری ذمہ داریاں'' کے عنوان سے مذاکرہ کی صورت میں تھی جس کی صدارت سینیٹر پروفیسر خورشید احمد نے کی اور اس سے سینیٹر پروفیسر غفور احمد، مولانا قاضی عبد اللطیف اور دیگر ارباب دانش کے خطابات کے علاوہ راقم الحروف کو بھی اظہار خیال کی دعوت دی گئی۔ اس حوالہ سے ذہن میں ترتیب پانے والی گفتگو کا وقت کی قلت کے باعث مذاکرہ میں صرف خلاصہ پیش کیا جا سکا جبکہ اس گفتگو کی قدرے تفصیلی صورت کچھ یوں ہے:

''عصر حاضر کے چیلنجز اور ہماری ذمہ داریاں'' کے عنوان سے اس نشست میں گفتگو کے لیے کہا گیا ہے۔ مجھ سے قبل مختلف اصحاب دانش نے ملت اسلامیہ کو درپیش متعدد چیلنجز کا ذکر کیا ہے اور ان پر روشنی ڈالی ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ہر طرف چیلنج ہی چیلنج ہیں۔ سیاست، معیشت، معاشرت، تعلیم، تہذیب وثقافت، سائنس، ٹیکنالوجی، اخلاقیات اور فکر وفلسفہ کے میدانوں میں مسلمانوں کو بہت سے چیلنجز کا سامنا ہے۔ اگر ان کی صرف فہرست بیان کی جائے تو اس کے لیے خاصا وقت درکار ہوگا اور پھر ان کی ترجیحات بھی اپنے اپنے ذوق اور حالات کے مطابق ہر صاحب فکر ودانش کے نزدیک مختلف ہوں گی۔ وقت بہت کم ہے، اس لیے میں اپنی سوچ کے حوالے سے صرف دو تین باتوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہوسکتا ہے بعض دیگر دوستوں کے نزدیک ان کی زیادہ اہمیت نہ ہو مگر میں انہیں بنیادی حیثیت دیتا ہوں اور دینی مدارس اور ان کے اساتذہ وطلبہ کے مجموعی ماحول کے تناظر میں درپیش چیلنجز میں میرے نزدیک یہ امور سرفہرست ہیں۔

پہلی بات جسے میں ''بے خبری کا بحران'' سے تعبیر کرتا ہوں، یہ ہے کہ دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کی غالب

اکثریت آج کے عالمی حالات اور ماحول دونوں سے بے خبر ہے۔ ہمیں نہ دنیا کے جغرافیے کا علم ہے اور نہ تاریخ کا۔ ہمیں یہ معلوم ہی نہیں کہ آج کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے، کون کیا کر رہا ہے، کیسے کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے؟ افراد کی بات نہیں کرتا۔ دو چار فی صد حضرات ضرور اس سے مستثنیٰ ہوں گے لیکن مجموعی صورت حال یہی ہے جو میں نے عرض کی ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال سے صورت حال کا اندازہ کر لیجیے کہ ابھی چند روز قبل تیس چالیس حضرات کی ایک محفل میں، جنہیں آپ علما ہی سمجھ لیجیے، میں کافر اقوام کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات پر گفتگو کر رہا تھا جس کے دوران میں نجران کے عیسائیوں کے ساتھ جناب نبی اکرم ﷺ کے معاہدہ کا تذکرہ بھی ہوا۔ میں نے شرکائے محفل سے سوال کیا کہ نجران کہاں ہے؟ آپ یقین کیجیے کہ شرکا میں سے کوئی صاحب نہ بتا سکے اور بالآخر مجھے ان کو یہ بتانا پڑا کہ یہ جزیرۃ العرب میں ہے اور اس وقت سعودی عرب کا حصہ ہے۔

ہمیں فقہ اور افتا کے اصولوں کی تعلیم و تربیت کے دوران میں عام طور پر یہ بتایا جاتا ہے کہ: من لم یعرف اھل زمانہ فھو جاھل۔ جو شخص اپنے زمانہ کے لوگوں کو نہیں پہچانتا، وہ جاہل ہے۔ لیکن اس کے مفہوم اور عملی تقاضوں کی طرف ہماری توجہ نہیں ہوتی اور عالمی حالات کے تناظر میں ہم میں سے اکثر لوگ زندگی بھر خود اس کا مصداق بنے رہتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ آج ہم جس جنگ اور کشمکش سے دوچار ہیں، اسے آپ جنگ سے تعبیر کر لیں یا کھیل سمجھ لیں لیکن یہ بات طے ہے کہ جنگ اور کھیل دونوں کے کچھ اصول ہوتے ہیں، کچھ قواعد ہوتے ہیں، کچھ طے شدہ طریقے ہوتے ہیں اور کچھ ہتھیار اور آلات ہوتے ہیں جو حالات کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور جن کی پابندی جنگ اور کھیل کے دونوں فریقوں کے لیے لازمی سمجھی جاتی ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم فکر و فلسفہ، تہذیب و ثقافت، تعلیم و تربیت اور دعوت و ابلاغ کے محاذوں پر آج کے طریقہ جنگ سے شناسائی نہیں رکھتے، قواعد اور طریقہ کار کی ہمیں کچھ خبر نہیں ہے، آج کے ہتھیاروں اور آلات سے ہمیں آگاہی حاصل نہیں ہے اور دشمن کی قوت کار، دائرۂ عمل، طریق جنگ اور ہتھیاروں کی نوعیت سے ہم اکثر و بیشتر بے خبر ہوتے ہیں۔

میں دینی مدارس کے ماحول کی بات کر رہا ہوں، اساتذہ و طلبہ کی بات کر رہا ہوں۔ اگر آپ حضرات کو میری بات تلخ لگے تو میں معافی چاہتا ہوں لیکن معذرت کے ساتھ یہ عرض کرنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ میں نے زمانہ سے بے خبری اور دشمن کے ہتھیاروں اور طریق جنگ سے ناواقفیت کی جو بات کی ہے، وہ بالکل درست ہے، اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے اور ہمارے اساتذہ اور طلبہ کی اکثریت اسی حال میں مگن ہے۔ اسے بے خبری کا بحران کہہ لیں، ادراک و احساس کے فقدان سے تعبیر کر لیں یا کمیونیکیشن کے خلا (Communication gap) کا عنوان دے لیں، مگر یہ

بحران موجود ہے اور میرے نزدیک دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ کے لیے آج کا سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ وہ اس بحران سے نجات حاصل کریں، بے خبری کے اس خلا کو پر کریں اور فکر وعقیدہ اور تہذیب وعقیدہ کی یہ جنگ جذباتی اور سطحی نعروں کے ذریعے سے نہیں بلکہ ادراک واحساس، فہم ودانش اور شعور وباخبری کے ہتھیاروں کے ساتھ لڑیں۔

تیسرے نمبر پر میں ایک اور چیلنج اور بحران کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ امریکہ نے پاکستان کے دینی مدارس کی اصلاح کے لیے اربوں روپے دیے ہیں اور یورپی یونین نے خطیر رقم کی بطور امداد پیش کش کر دی ہے۔ یہ روپیہ آپ کے ماحول میں پھیلے گا اور آپ کے تعلیمی نظام ونصاب کو سبوتاژ کرنے کے لیے صرف ہوگا۔ آپ سے آج کی دنیا کو سب سے بڑی شکایت یہ ہے کہ آپ عقیدہ کی تعلیم دیتے ہیں، کمٹ منٹ کی تعلیم دیتے ہیں۔ آپ تعلیم برائے تعلیم کے بجائے تعلیم برائے عقیدہ اور تعلیم برائے دین کے فلسفہ پر عمل کر رہے ہیں اور عقیدہ وثقافت کی صرف تعلیم ہی نہیں دیتے بلکہ آپ حضرات نے اپنے عملی ماحول کو بھی اس کے مطابق ڈھال رکھا ہے۔ عقیدہ وثقافت کے ساتھ بے لچک کمٹ منٹ اور اس کے مطابق معاشرتی ماحول کا تحفظ یہ دونوں باتیں آج کی دنیا کے لیے اجنبی ہیں، ناقابل قبول ہیں بلکہ ناقابل برداشت ہیں۔ امریکہ اور یورپی یونین کی دی ہوئی دولت اسی کمٹ منٹ کو کمزور کرنے کے لیے استعمال ہوگی اور آپ کے دینی اور ثقافتی ماحول کو تبدیل کرنے کے لیے صرف ہوگی۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اصل بات عقیدہ وثقافت اور اس کے مطابق ماحول کی ہے۔ اگر یہ دونوں تبدیل ہو گئے اور ان میں دراڑ ڈالنے میں کامیابی حاصل ہوگئی تو خالی تعلیم باقی رہ جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ پھر اگر دینی مدارس باقی رہیں تو بھی کوئی نقصان نہیں کیونکہ عقیدہ وثقافت کی کمٹ منٹ اور عملی دینی ماحول کے بغیر بننے والا مولوی یورپ کے اس پادری سے مختلف نہیں ہوگا جو صرف تنخواہ کے لیے ڈیوٹی دیتا ہے اور ڈیوٹی کے علاوہ باقی اوقات میں وہ عام سوسائٹی کے ماحول میں اس طرح گھل مل جاتا ہے کہ جیسے مذہب اور اس کی تعلیمات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

دینی مدارس کے منتظمین، اساتذہ اور طلبہ کو اس بارے میں چوکنا رہنا ہوگا اور اپنے عقیدہ وثقافت اور عملی دینی ماحول کو بچانے کے لیے خودداری، حوصلہ، دینی حمیت اور ایثار وقربانی کے ساتھ اس خطرناک چیلنج کا سامنا کرنا ہوگا۔ خدا کرے کہ ہم اس حوالے سے اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر نباہ سکیں۔ آمین یارب العالمین

صحابہ کرام کے اسلوب دعوت میں انسانی نفسیات کا لحاظ

(۲)

مناسب وقت کا انتظار / موقع کی مناسبت

دعوت دین کے ہر کارکن کو اپنے گرد و پیش کا پوری ہوشیاری اور مستعدی سے جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ دعوت کی تخم ریزی کے لیے جیسے ہی کوئی مناسب موقع ہاتھ آئے، وہ بڑی ہوشیاری کے ساتھ اس سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس کی بہترین مثال ہمیں حضرت یوسفؑ کی سیرت میں ملتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

''اور ان کے ساتھ دو اور جوان بھی جیل میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے کہا: میں اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں، اور دوسرے نے کہا: میں اپنے کو دیکھتا ہوں کہ میں اپنے سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے چڑیاں کھا رہی ہیں۔ آپ ہمیں اس کی تعبیر بتائیے۔ ہم آپ کو خوب کاروں میں سے سمجھتے ہیں۔ آپؑ نے فرمایا: جو کھانا تمہیں ملتا ہے وہ آئے گا نہیں کہ میں اس کے آنے سے پہلے پہلے تمھیں اس کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ اس علم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھایا ہے۔ میں نے ان لوگوں کے مذہب کو چھوڑا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت سے یہی لوگ منکر ہیں اور میں نے اپنے بزرگوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے مذہب کی پیروی کی۔ ہمیں حق نہیں کہ ہم کسی چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں۔ یہ اللہ کا ہم پر اور لوگوں پر فضل ہے لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔ اے میرے جیل کے دونوں ساتھیو! کیا الگ الگ بہت سے رب بہتر ہیں یا اکیلا اللہ ہی سب پر حاوی و غالب؟ تم اس کے سوا نہیں پوجتے مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ اختیار اور اقتدار صرف اللہ ہی کا ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو۔ یہی دین قیم ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اے میرے جیل کے دونوں ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلانے کی خدمت انجام دے گا۔ رہا دوسرا تو اس کو سولی دی جائے گی، پھر پرندے اس کے سر کو نوچ نوچ کر کھائیں گے، اس امر کا فیصلہ ہوا جس کے بارے میں تم پوچھ رہے تھے'' (۱)

اس پورے واقعہ میں داعی حق کے لیے جو نقطہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ جب وہ دونوں آدمی محسوس کرتے ہیں کہ اپنے کردار و اوصاف کی بنا پر حضرت یوسفؑ ہی ایسے فرد ہیں جن کی طرف وہ اپنی غرض کے لیے رجوع کر سکتے ہیں تو حضرت یوسفؑ اس موقع پر یہ نہیں کرتے کہ ان پر اپنی بزرگی کا رعب جمانے کی کوشش کریں، بلکہ وہ ان کے اس التفات کو غنیمت سمجھتے ہوئے ان کے سامنے فوراً دعوت حق پیش فرماتے ہیں اور اس کے لیے انھوں نے ایسا اسلوب اختیار فرمایا کہ گویا بات سے بات چل نکلی ہے نہ کہ قصداً ایک بات کہنے کے لیے موقع پیدا کیا گیا ہے۔ صحابہ کرامؓ کی سیرت کے تفصیلی مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے بھی دعوت و تبلیغ کے لیے بارہا اس اسلوب کو اختیار کیا۔ سیرت صحابہ سے اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

حضرت شداد بن اوسؓ ایک مریض کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ مریض سے پوچھا: کیا حال ہے؟ اس نے کہا: اللہ کے فضل سے اچھا ہوں۔ حضرت شدادؓ نے دیکھا کہ زمین ہموار ہے اور مریض بیماری کے باوجود اللہ کی رضا پر راضی ہے تو فوراً گویا ہوئے:

أبشر بكفارات السيئات و حط الخطايا — میں تم کو مرض کے کفارۂ گناہ ہونے کی بشارت سناتا ہوں۔

کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میں کسی شخص کو آزمائش میں مبتلا کروں اور وہ میری حمد کرے تو وہ گناہوں سے ایسے پاک ہو جاتا ہے جیسے اپنی ماں کے پیٹ سے ابھی پیدا ہوا ہو۔ (۲)

حضرت طلیبؓ بن عمیر خفیہ دعوت کے مرحلے میں دار ارقم میں ایمان لائے۔ جب دولت ایمان سے مستفید ہو چکے تو اپنی والدہ اروٰی بنت عبدالمطلب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: میں نے اسلام قبول کر لیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی اتباع اختیار کر لی ہے تو ان کی والدہ کہنے لگیں، اپنے ماموں زاد بھائی کی امداد و اعانت کرنا بڑی اچھی بات اور ایک حق کی ادائیگی ہے۔ اگر ہم عورتوں میں مردوں جیسی طاقت ہوتی تو ہم بھی آپ ﷺ کی اتباع کرتیں اور ہر مدافعت میں آپ ﷺ کا ساتھ دیتیں۔ (۳) حضرت طلیبؓ بن عمیر نے دیکھا کہ والدہ اسلام کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہیں اور اسلام کی طرف مائل ہیں تو انھوں نے فوراً کہا:

ايمنعك ان تسلمي و تتبعيه ، فقد اسلم اخوك حمزةؓ؟ فقالت: انتظر ما يصنع أخواتي ، ثم اكون إحداهن قال : فقلت : فاني اسألك بالله الا أتيته و سلمت عليه — آپ کو اسلام لانے اور آپ ﷺ کا اتباع کرنے سے کیا چیز مانع ہے؟ جبکہ آپ کے بھائی حمزہؓ بھی اسلام لا چکے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا: میں یہ انتظار کر رہی ہوں کہ میری بہنیں کیا کرتی ہیں، میں اپنی بہنوں سے باہر نہیں،

وصدّقته ، وشهدت ان لا اله الا اللّٰه ، قالت : فانی اشهد ان لا اله الا اللّٰه ، واشهد ان محمداً رسول اللّٰہ ﷺ، ثم کانت تعضد النبی ﷺ بلسانها وتحض ابنها علی نصر ته والقیام بامره (۴)

حضرت طلیبؓ نے عرض کیا: اماں جان! میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ آپ ضرور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں اور آپ کو سلام کریں، آپ کی تصدیق کریں اور اس بات کی گواہی دیں کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں۔ حضرت ارویٰؓ نے کہا: میں گواہی دیتی ہوں کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اس کے بعد یہ (اپنے بڑھاپے کے باعث) رسول اللہ ﷺ کے کام میں اپنی زبان کے ذریعے مدد کرتی تھیں اور اپنے بیٹے کو آپ ﷺ کی مدد کرنے اور آپ ﷺ کے مقاصد کو پورا کرنے پر ابھارا کرتیں تھیں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ کے صحابہ جمع تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے علی الاعلان دعوتِ اسلام کی اجازت طلب کی۔ آپ ﷺ نے منع فرمایا لیکن پھر ابوبکرؓ کے اصرار پر اجازت دے دی، چنانچہ تمام صحابہ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں بیت اللہ میں تشریف لے گئے۔ ابوبکرؓ لوگوں کے درمیان خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور اسلام میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے لوگوں کو کھلم کھلا اسلام کی دعوت دی۔ چنانچہ مشرکین مکہ ان پر ہر طرف سے ٹوٹ پڑے اور آپؓ کو خوب مارا، حتیٰ کہ بچنے کی کوئی امید نہ رہی۔ آپؓ کے قبیلہ بنو تیم کے لوگ آپ کو اٹھا کر گھر لے گئے، ہوش آیا تو پہلا سوال یہ تھا: رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟ بتایا گیا کہ حضور ﷺ خیریت سے ہیں۔ آپؓ دار ارقم میں حاضر ہوئے اور جب تک رسول اللہ ﷺ کو دیکھ نہ لیا، مطمئن نہ ہوئے اور پھر بارگاہ رسالت میں عرض کیا:

یا رسول اللّٰہ ﷺ ! هذه أمی وأنت مبارك فادع لها وادعها الی الاسلام لعل اللّٰه ان یستنقذ ها بك من النار فدعا لها رسول اللّٰہ ﷺ ودعا ها الی اللّٰه فاسلمت (۵)

اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ میری والدہ محترمہ ہیں، آپ ﷺ ان کے لیے دعا کیجیے اور ان کو اسلام کی طرف بلائیں شاید کہ اللہ آپ کے ذریعہ سے ان کو جہنم سے بچالے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے دعا کی اور ان کو اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔

حضرت ابوبکرؓ نے جب دیکھا کہ ان کی والدہ پر دن بھر کے واقعات کا ایک خاص اثر ہے اور ان کے دل میں اپنے بیٹے اور اس کے مقاصد کے لیے ہمدردی کے آثار موجود ہیں تو انھوں نے ایک سچے داعی کی طرح موقع مناسب سمجھتے ہوئے اپنی والدہ کو اسلام کی دعوت دی جس کے نتیجہ میں انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

ایک آدمی نے ابن عباسؓ سے جمعہ کے دن غسل کرنے کے بارے میں سوال کیا کہ کیا یہ واجب ہے؟ ابن عباس نے فرمایا: نہیں جو چاہے، غسل کرے۔ اور پھر فرمایا کہ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ غسل جمعہ کی ابتدا کیسے ہوئی۔ دراصل عہد رسالت میں لوگ غریب اور محتاج تھے، وہ اون کے کپڑے پہنتے تھے، دن بھر کھیتوں میں کام کرنے کی وجہ سے پسینہ آتا، جس سے کپڑوں کی بدبو مزید بڑھ جاتی، جس کی وجہ سے دوسرے مسلمانوں کو تکلیف ہوتی تھی چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا:

یا ایھا الناس ! اذا جئتم الجمعة فاغتسلوا، ولیمس احدکم من اطیب طیب ان کان عندہ(٦)	اے لوگو! جب تم جمعہ کے لیے آؤ تو غسل کر لیا کرو، اور جس کے پاس خوشبو ہو وہ خوشبو مل لیا کرے۔

ابن عباسؓ اگر چاہتے تو سائل کو صرف یہ کہہ کر رخصت کر سکتے تھے کہ جمعہ کے دن غسل واجب ہے یا نہیں، لیکن انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سائل کو غسل جمعہ کے پورے پس منظر اور تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

اگرچہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کا ایک مستقل حلقۂ درس موجود تھا تاہم وہ جہاں لوگوں کو جمع دیکھتے یا جہاں موقع کی مناسبت سے کچھ کہنے کی ضرورت ہوتی، فوراً لوگوں کو دین کی طرف متوجہ کرتے، چنانچہ ایک دفعہ ابوموسیٰ اشعریؓ اصفہان کی مہم سے واپس لوٹ رہے تھے کہ ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ لوگوں کا کافی مجمع تھا۔ موقع مناسب جانتے ہوئے آپ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: میں تم لوگوں کو ایک حدیث سنانا چاہتا ہوں جو ہم لوگوں کو رسول اللہ ﷺ نے سنائی تھی۔ لوگوں نے کہا: اللہ آپؓ پر رحم کرے، ضرور سنائیے۔ بولے: رسول اللہ نے فرمایا: قیامت کے قریب ''ہرج'' زیادہ ہوگا۔ لوگوں نے عرض کیا: ہرج کیا ہے؟ فرمایا: قتل اور جھوٹ۔ لوگوں نے عرض کیا: اس سے بھی زیادہ قتل ہوگا جتنا ہم لوگ کرتے ہیں؟ فرمایا اس سے مقصد کفار کا قتل نہیں بلکہ باہمی خونریزی ہے، حتیٰ کہ پڑوسی پڑوسی کو، بھائی بھائی کو، بھتیجا چچا کو اور چچا بھتیجے کو قتل کرے گا۔ لوگوں نے کہا سبحان اللہ، کیا عقل و ہوش رکھتے ہوئے؟ فرمایا: عقل و ہوش کہاں؟ عقل و ہوش تو اس زمانہ میں باقی نہ رہے گا، حتیٰ کہ آدمی خیال کرے گا کہ وہ کسی حق بات پر ہے لیکن درحقیقت وہ کسی حق بات پر نہ ہوگا''۔(٧)

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے لوگوں کو یہ خطبہ اس وقت دیا جب وہ لوگ گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ جہاں میدانِ جہاد کی نسبت ان برائیوں میں مبتلا ہونے کے امکانات کئی گنا زیادہ تھے، اس لیے آپؓ نے ایک مناسب موقع پر ضروری تعلیم دینا لازمی سمجھا تاکہ لوگ ان گناہوں میں مبتلا نہ ہوں اور زبانِ رسالت سے نکلنے والی وعید کے مستحق نہ بن جائیں۔

ایک دفعہ حضرت ابوالدرداءؓ دمشق کی جامع مسجد میں، جہاں آپ کا حلقہ درس قائم تھا، اپنے ہاتھ سے شجر کاری کر رہے تھے۔ اسی دوران ایک آدمی ان کے پاس سے گزرا۔ آپؓ کو دیکھ کر بڑے تعجب سے کہنے لگا: آپؓ رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہو کر ایسا معمولی کام اپنے ہاتھ سے کر رہے ہیں؟ حضرت ابوالدرداءؓ نے اس کی حیرت زائل کرتے ہوئے فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے:

من غرس غرساً لم یأکل منه آدمی و لا خلق من خلق اللّٰه الا کان له صدقة(۸)

جس کسی نے کوئی پودا لگایا اور اس میں سے اگر کسی آدمی یا اللہ کی مخلوق میں سے کسی مخلوق نے کھایا تو وہ اس کے لیے صدقہ ہے۔

حضرت عائشہؓ موسم حج میں منیٰ میں خیمہ زن تھیں۔ لوگ ملاقات کو آ رہے تھے، چند قریشی نوجوانوں کو دیکھا کہ وہ ہنستے ہوئے آ رہے ہیں۔ آپؓ نے ہنسنے کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے عرض کیا کہ ایک صاحب خیمہ کی ڈوری میں الجھ کر ایسے گرے کہ ان کی آنکھ چلی جاتی یا گردن ٹوٹ جاتی، ہم لوگوں کو یہ دیکھ کر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ فرمایا: مت ہنسو! میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے:

ما من مسلم یشاك شو کةً فما فوقها، الا کتبت له بها درجة ،و محیت عنه بها خطیئة (۹)

کسی مسلمان کو کانٹا چبھ جائے یا اس سے معمولی مصیبت آئے تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ اس کا ایک درجہ بڑھا دیتا ہے اور ایک گناہ معاف فرما دیتا ہے۔

تالیف قلب

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی عملی زندگی میں قوتِ محرکہ اس کا دل ہے، اور اسی کی بدولت انسانی شخصیت انقلاب سے دوچار ہوتی ہے۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

الا و ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت فسد

آگاہ رہو کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جب وہ سنور جاتا ہے تو تمام بدن سنور جاتا ہے۔

الجسد کله الا و ھی القلب (۱۰) اور جب وہ خراب ہوجاتا ہے تو تمام بدن خراب ہوجاتا ہے۔سنو وہ ٹکڑا دل ہے۔

گویا انسانی جذبات کا مرکز دل ہے اور جب داعی دل کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوگیا تو وہ یقینی طور پر مخاطب کو صراطِ مستقیم پر گامزن کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسلام کے کئی شدید ترین دشمنوں کو محض تالیف قلب کی بنا پر حلقہ بگوش اسلام کرلیا۔☆

صحابہ کرامؓ نے بھی کئی لوگوں کو محض تالیف قلب کے اسلوب کو اختیار کرتے ہوئے مائل بہ اسلام کیا چنانچہ ابوداؤد کی روایت ہے کہ ایک صحابی نے، جو پانی کے ایک چشمے کے مالک تھے، اپنی قوم کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے کہا کہ اگر وہ لوگ اسلام قبول کرلیں تو ان کو سو اونٹ دیے جائیں گے۔ چنانچہ قوم ان کی ترغیب اور تالیف قلب سے مسلمان ہوگئی تو انھوں نے ان میں سو اونٹ تقسیم کردیے۔(۱۱)

مدعو کی تعریف و تحریک / حوصلہ افزائی

دعوت کے ہر کارکن کی حیثیت ایک مہربان استاد اور مربی کی سی ہونی چاہیے۔ داعی کا اپنے مخاطبین سے ایسا رویہ جس میں اپنائیت، محبت اور حوصلہ افزائی کا رنگ نمایاں ہو، دعوت کی کامیابی میں اولین پتھر کا کام دے سکتا ہے۔ بسا اوقات مدعو کی تعریف و توصیف اور مناسب حوصلہ افزائی اس کو داعی کے اس قدر قریب کردیتی ہے کہ اس کے بعد دعوت کا کام آسان ہوجاتا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے دعوت و تبلیغ میں اس اسلوب کو بھی استعمال

☆ غزوۂ حنین میں ملنے والے مال غنیمت کو رسول اللہ ﷺ نے روساء مکہ میں ان کی تالیف قلب کی خاطر تقسیم کردیا، چنانچہ مکہ کے کئی سرداروں نے اسی جذبہ سے متاثر ہوکر صدق دل سے اسلام قبول کرلیا، پھر حق کے خلاف ان کی گردنیں کبھی نہ اٹھ سکیں۔ صفوان بن امیہ جو اسلام کے اور خود رسول اللہ ﷺ کے شدید ترین دشمن تھے، کہتے ہیں:

واللّٰہ لقد اعطانی رسول اللّٰہ ﷺ ما اعطانی، وانہ لا بغض الیّ فما برح یعطینی حتٰی انہ لاحبّ الناس الیّ (صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی سخا ئہ ﷺ، ح:۶۰۲۲، ص:۱۰۲۲)

''قسم بخدا رسول اللہ ﷺ نے مجھے اتنا دیا جس کی کوئی حد نہیں جبکہ مجھے ان سے سخت بغض تھا۔ آپ ﷺ مجھے دیتے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ مجھے تمام انسانوں سے زیادہ محبوب ہوگئے''۔

ایک دفعہ ایک بدو نے آکر کہا: ان دو پہاڑوں کے درمیان بکریوں کے جتنے ریوڑ ہیں مجھ کو عنایت کردیں۔ آپ ﷺ نے وہ سب اس کو عطا فرما دیے۔ یہ فیاضی اور احسان دیکھ کر اس پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے اپنے پورے قبیلے سے جا کر کہا:

یا قوم اسلموا فان محمدا ﷺ یعطی عطاء لا یخشی الفاقۃ (ایضاً، ح:۶۰۲۰، ص:۱۰۲۱)

''اے قوم! اسلام قبول کرلو، محمد ﷺ اتنا دیتے ہیں کہ ان کو اپنے فقر و افلاس کا ڈر ہی نہیں رہتا''

کیا، چنانچہ جب لوگ دور دراز سے صحابہ کرامؓ کی خدمت میں طلبِ علم اور مسائلِ دینیہ کی سوجھ بوجھ حاصل کرنے کے لیے آتے تو وہ نہایت کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے ان کا خیر مقدم کرتے۔ ابو ہارون کا بیان ہے کہ ہم لوگ حضرت ابوسعید الخدریؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپؓ یہ کہتے ہوئے ہمارا استقبال کرتے:

مرحباً بوصية رسول اللّٰہ ﷺ ان النبی ﷺ قال: ان الناس لکم تبعَ وان رجالا یأتونکم من اقطار الارض یتفقّھون فی الدین واذا اتوکم فاستوصوابھم خیرًا (۱۲)

خوش آمدید! بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارے پاس دنیا کے کونے کونے سے دین سیکھنے کے لیے لوگ آئیں گے، ان کے ساتھ بھلائی کرنا۔

حسن بصری کا بیان ہے کہ ہم لوگ حضرت ابو ہریرہؓ کی عیادت کو گئے، جب لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے ان کا گھر بھر گیا تو انھوں نے خاکساری سے اپنے پاؤں سمیٹ لیے اور فرمایا: ایک دن ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ لیٹے ہوئے تھے ہم لوگوں کو دیکھا تو اسی طرح پاؤں سمیٹ لیے اور فرمایا:

انہ سیأتیکم اقوام من بعدی یطلبون العلم فرحبوا بھم وحیّوھم وعلّموھم (۱۳)

میرے بعد عنقریب لوگ تمہارے پاس تحصیل علم کے لیے آئیں گے ان کو مرحبا کہنا، سلام کہنا اور علم سکھانا۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کے پاس جب نوعمر اور جوان طلبا آتے تو آپؓ ان کو اپنے سے مانوس اور قریب کرنے کے لیے فرماتے:

مرحبا بوصية رسول اللّٰہ ﷺ! أمرنا رسول اللّٰہ ﷺ ان نوسع لھم فی المجلس، ونفقّھھُم الحدیث، فانکم خلوفنا والمحدثون بعدنا، وکان مما یقول للحدث: اذا انت لم تفھم الشیٔ استفھمنیہ! فانك ان تقوم وقد فھمتہ احب الیّ من ان تقوم ولم تفھمہ (۱۴)

خوش آمدید ہو! ان لوگوں کو جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ہمیں وصیت فرمائی تھی، کہ ہم ان کے لیے مجلس میں گنجائش پیدا کریں اور ان کو حدیث سمجھائیں، کیونکہ آپ لوگ ہی ہمارے بعد ہمارے نائب اور دوسروں کو احادیث سنانے والے ہیں۔ اگر تمہیں کوئی بات سمجھ نہ آئے مجھ سے سمجھ لینا کیونکہ تم سمجھ کر اٹھو، یہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ تم بے سمجھے اٹھ جاؤ۔

ایک دفعہ عبداللہ بن عمروؓ کا حلقہ درس قائم تھا۔ لوگوں کی کثیر تعداد جمع تھی، اتنے میں ایک آدمی مجلس کو چیرتا ہوا آگے بڑھا، لوگوں نے اس کو روکنا چاہا لیکن آپؓ نے کمال شفقت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: اس کو آنے دو۔ وہ آیا یہاں تک کہ آپؓ کے پاس بیٹھ گیا اور بولا:

أخبرني لشيء حفظته من رسول الله ﷺ، فقال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، والمهاجر من هجر ما نهى الله عنه (۱۵)

رسول اللہ ﷺ کا کوئی فرمان یاد ہو تو بیان کیجئے۔ فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مہاجر وہ ہے جو اللہ کی منع کی ہوئی باتوں کو چھوڑ دے۔

لوگ مختلف مسائل میں ازواجِ مطہرات بالخصوص حضرت عائشہ صدیقہؓ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ بعض مسائل کے پوچھنے میں جھجک اور شرم مانع آتی تھی تو ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سائلین کی حوصلہ افزائی فرماتیں، چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو ایک مسئلہ کے دریافت کرنے میں حیا اور شرم مانع ہوئی تو آپؓ نے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا:

لا تستحي ان تسألني عما كنت سائلاً عنه امك التي ولدتك فانما انا امك (۱۶)

تو اس بات کو پوچھنے میں شرم مت کر! جو تو اپنی سگی ماں سے پوچھ سکتا ہے، جس نے تجھے جنا ہے۔ میں بھی تو تیری ماں ہوں۔

دعوت میں ایجاز واختصار

دعوت وتبلیغ کو مؤثر بنانے کے لیے مضامین دعوت کا واضح، دوٹوک اور مختصر ہونا بھی ایک بہترین اسلوب ہے۔ صحابہ کرامؓ کے دعوتی وتبلیغی خطبات میں فصاحت وبلاغت کے ساتھ ساتھ ایجاز واختصار کی جھلک بڑی نمایاں ہوتی تھی۔ ابووائل بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمار بن یاسرؓ نے ہمیں فصیح وبلیغ خطبہ دیا۔ لوگوں نے آپ کے بیان کی خوب تعریف کی، لیکن آپ کا بیان اس قدر مختصر تھا کہ لوگوں نے خواہش کی کہ کاش آپ مزید بیان فرماتے؟ تو آپؓ نے فرمایا:

انی سمعت رسول الله ﷺ يقول: ان طول صلاة الرجل وقصر خطبته مئنة

میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے: نماز کو طول دینا اور خطبہ کو مختصر کرنا انسان کی سمجھ کی

من فقهه فأطيلوا الصلوة واقصروا الخطبة (۱۷)

علامت ہے، پس تم نماز کو لمبا کرو اور خطبہ مختصر دیا کرو۔

صحابہ کرامؓ نے دعوت وتبلیغ میں ایجاز واختصار کے اسلوب کو نہ صرف خود اختیار فرمایا بلکہ دوسروں کو بھی تلقین کی کہ وہ وعظ ونصیحت کو مختصر رکھیں۔ ایک دفعہ حجاج بن یوسف ابن عمرؓ کے ہمراہ خطبہ حج کے لیے روانہ ہوا۔ ابن عمرؓ کے صاحبزادے سالم بن عبداللہؒ بھی ساتھ تھے۔ انھوں نے حجاج کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: اگر آج تم سنت کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو مختصر خطبہ دینا اور نماز جلدی پڑھانا، حجاج بن یوسف ابن عمرؓ کی طرف دیکھنے لگا کہ اس بارے میں وہ کیا فرماتے ہیں، ابن عمرؓ نے یہ بات دیکھی تو فرمایا: سالم نے ٹھیک کہا ہے۔ (۱۸)

حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا بیان اور خطبہ بڑا مختصر، جامع اور پر اثر ہوتا تھا۔ حضرت ابوالدرداؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا پھر آپ کے حکم سے حضرت ابوبکرؓ اور عمر فاروقؓ نے بیان فرمایا اور دونوں حضرات نے اپنے بیان کو مختصر رکھا، ان کے بعد عبداللہؓ بن مسعود کو حکم ہوا کہ کچھ بیان کریں۔ حکم کی تعمیل میں کھڑے ہوئے اور حمد وسلام کے بعد فرمایا:

ایھاالناس! ان اللّٰہ ربنا وان الاسلام دیننا وان ھذا نبینا۔ وأوما بیدہ الی النبی ﷺ۔ رضینا مارضی اللّٰہ لنا ورسولہ والسلام علیکم

اے لوگو! اللہ ہمارا رب اور اسلام ہمارا دین ہے اور آپ ﷺ ہمارے نبی ہیں۔ اور اپنے ہاتھ سے رسول اللہ ﷺ کی طرف اشارہ کیا۔ جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ خوش ہوں اس سے ہم بھی خوش ہیں، اور تم پر سلامتی ہو۔

اس کے بعد عبداللہ بن مسعودؓ بیٹھ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس مختصر مگر جامع بیان کی بہت تعریف وتحسین فرمائی اور فرمایا: ''ابن ام عبد نے سچ کہا''۔ (۱۹)

مخاطب کی زبان میں گفتگو

ابلاغ اور تفہیم کے لیے زبان ولسان کی اہمیت مسلم ہے۔ دعوت وتبلیغ میں تاثیر اور قوت اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے، جب پیغام کی زبان آسان، نرم اور قابل فہم ہو، اور اگر اس کے ساتھ ساتھ داعی مدعو کی زبان سے بھی واقفیت رکھتا ہو تو دعوت کا کام مزید آسان ہو جاتا ہے، کیونکہ ہم زبانی سے انسیت میں اضافہ ہوتا ہے، اجنبیت دور ہوتی ہے اور گفتگو کا مقصد آسانی سے سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اس اسلوب کو اختیار فرمایا۔ عرب اگرچہ عربی زبان ہی بولتے تھے لیکن ان کے مختلف قبائل اور علاقوں میں لہجوں کا

اختلاف پایا جاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس بہت سے قبائل سے وفود آتے اور اسلام قبول کرتے تو آپ ﷺ ان کے ساتھ ان ہی کی زبان اور لہجے میں گفتگو فرماتے۔ خطیب بغدادی نے اپنی سند سے کعب بن عاصم الاشعری کا قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو مخصوص لہجے میں بات کرتے سنا:

عن عاصم الاشعریؓ قال: سمعت رسول اللّٰہ ﷺ یقول : لیس من امبرامصیام فی امسفر، اراد لیس من البر الصیام فی السفر (۲۰)

اشعریوں کی لغت میں لام کو میم سے تبدیل کرلیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے لہجہ کو چھوڑ کر مخاطب کے لہجہ کو اختیار فرمایا۔ بلاشبہ اس سے مدعو پر خوشگوار اثر پڑتا ہے اور اپنائیت اور قربت پیدا ہوتی ہے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو سریانی زبان سیکھنے کا حکم دیا، تاکہ یہود سے انھیں کی زبان میں گفتگو کی جاسکے اور انھیں کی زبان میں ان کے خطوط کا جواب دیا جاسکے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کا بیان ہے:

فتعلّمت کتابھم مامرت بی خمس عشرۃ لیلۃ حتی حذقتہ، و کنت اقرأ لہ کتبھم اذا کتبوا الیہ، واجیب عنہ اذا کتب (۲۱)

ایک ایرانی عورت حضرت ابوہریرہؓ کی خدمت میں استغاثہ لے کر آئی کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی ہے اور اب مجھ سے میرا بیٹا بھی چھیننا چاہتا ہے اس عورت نے یہ ساری گفتگو فارسی زبان میں کی اور ابوہریرہؓ نے بھی اس سے اسی زبان میں گفتگو کی اور پھر آپؓ نے بچہ عورت کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔ (۲۲)

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ نے دوسری قوموں کی زبانیں صرف اس غرض سے سیکھ رکھی تھیں تاکہ مخاطب سے براہ راست تبادلۂ خیال کرکے اس کے مسائل کا حل کیا جائے۔

صحابہ کرامؓ نے قرآن مجید کے بعض اجزا کا ترجمہ بھی دوسری زبانوں میں کیا تاکہ عربی زبان سے ناواقف لوگ اسلام کی حقیقی روح اور تعلیمات سے محروم نہ رہ جائیں۔ چنانچہ علامہ سرخسی لکھتے ہیں:

روی ان الفرس کتبوا الی سلمانؓ ان یکتب لھم الفاتحۃ بالفارسیۃ، فکانوا یقرؤن ذالك فی الصلوۃ حتٰی لانت السنتھم للعربیۃ (۲۳)

بیان کیا جاتا ہے کہ بعض نومسلم ایرانیوں نے حضرت سلمانؓ کی خدمت میں لکھا کہ ان کے لیے سورۃ الفاتحہ کو فارسی میں نقل کردیا جائے، چنانچہ وہ لوگ (اسی ترجمہ کو) نماز میں پڑھتے تھے یہاں تک کہ وہ عربی سیکھ گئے۔

اسی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک اور بڑے فقیہہ نے اپنی کتاب ''النہایۃ حاشیۃ الہدایۃ'' میں مزید

تفصیل درج کی ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ نے رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے یہ کام انجام دیا اور ان کے ترجمے کا ایک جز بھی نقل کیا ہے، ''بنام خداوند بخشایندہ مہربان'' (۲۴) یہ بسم اللہ کا ترجمہ ہے۔

شاہانِ عالم کی طرف بھیجے جانے والے نبوی سفراء کا معجزانہ طور پر انھیں قوموں کی زبان میں گفتگو کرنے لگ جانا بھی دعوت وتبلیغ میں زبان کی یکسانیت کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔ (۲۵)

حضرت عمر فاروقؓ بھی دعوت وتبلیغ میں زبان وبیان کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ چنانچہ انھوں نے حضرت سلمان فارسیؓ کو محاربات عراق وایران کے دوران اسلامی لشکر کا داعی مقرر کیا تھا۔ چنانچہ حضرت سلیمان فارسیؓ نے ہمیشہ بڑی حکمت، دانائی اور دلسوزی کے ساتھ دعوتِ اسلام کا فریضہ انجام دیا اور انھوں نے مقبوضہ علاقوں میں فارسی نژاد ہونے کی وجہ سے نومسلموں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ موالیوں اور نومسلموں میں انھیں اس قدر مقبولیت حاصل تھی کہ وہ لوگ انھیں اپنا ہیرو اور بطلِ جلیل تصور کرتے تھے۔

حوالہ جات

(۱) سورۃ یوسف ۱۲:۳۶۔۴۱

(۲) المسند، حدیث شدادؓ بن اوس، ح:۱۶۶۶۹، ۵/۱۰۴

(۳) الاستیعاب، تذکرہ طلیبؓ بن عمیر، ۲/۲۷۷۔۳۷۷

(۴) ایضاً، تذکرہ ارویؓ بن عبدالمطلب، ۴/۱۷۷۸

(۵) اسد الغابہ، تذکرہ ام خیرؓ بنت صخر، ۵/۵۸۰۔ الاصابہ، تذکرہ ام الخیرؓ بنت صخر، ۴/۴۴۷

(۶) المسند، مسند عبداللہ بن عباسؓ، ح:۲۴۱۵، ۱/۴۴۳

(۷) المسند، حدیث ابوموسیٰ الاشعریؓ، ح:۱۹۱۳۹، ۵/۴۵۴

(۸) المسند، حدیث ابودرداءؓ، ح:۲۶۹۶۰، ۷/۵۹۸

(۹) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب ثواب المومن فیما یصیب، ح:۶۵۶۱، ص:۱۱۲۷

(۱۰) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینہ، ح:۵۲، ص:۱۲

(۱۱) سنن ابی داوٗد، کتاب الخراج، باب فی العرافۃ، ح:۲۹۳۴، ص:۴۲۷

☆ غزوۂ حنین میں ملنے والے مالِ غنیمت کو رسول اللہ ﷺ نے روساء مکہ میں ان کی تالیف قلب کی خاطر تقسیم کر دیا، چنانچہ مکہ کے کئی سرداروں نے اسی جذبہ سے متاثر ہو کر صدق دل سے اسلام قبول کر لیا، پھر حق کے خلاف ان کی گردنیں کبھی نہ اٹھ سکیں۔ صفوان بن امیہ جو اسلام کے اور خود رسول اللہ ﷺ کے شدید ترین دشمن تھے، کہتے ہیں:

واللّٰہ لقد اعطانی رسول اللّٰہ ﷺ ما اعطانی، وانہ لا بغض الیَّ فما برح یعطینی حتٰی انہ لاحبّ

الناس الیّ (صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی سخا ئہ ﷺ، ح:۶۰۲۲، ص:۱۰۲۲)

''قسم بخدا رسول اللہ ﷺ نے مجھے اتنا دیا جس کی کوئی حد نہیں جبکہ مجھے ان سے سخت بغض تھا۔ آپ ﷺ مجھے دیتے رہے یہاں تک کہ آپ ﷺ مجھے تمام انسانوں سے زیادہ محبوب ہو گئے''۔

ایک دفعہ ایک بدو نے آ کر کہا: ان دو پہاڑوں کے درمیان بکریوں کے جتنے ریوڑ ہیں مجھ کو عنایت کر دیں۔ آپ ﷺ نے وہ سب اس کو عطا فرما دیے۔ یہ فیاضی اور احسان دیکھ کر اس پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے اپنے پورے قبیلے سے جا کر کہا:

یا قوم اسلموا فان محمدا ﷺ یعطی عطاء لا یخشی الفاقة (ایضاً، ح:۶۰۲۰، ص:۱۰۲۱)

''اے قوم! اسلام قبول کر لو، محمد ﷺ اتنا دیتے ہیں کہ ان کو اپنے فقر و افلاس کا ڈر ہی نہیں رہتا''

(۱۲) جامع الترمذی، ابواب العلم، باب ماجاء فی الاستیعاء بمن یطلب العلم، ح:۲۶۵۰، ص:۶۰۱۔ سنن ابن ماجہ، المقدمہ، باب الوصاۃ بطلبہ العلم، ح:۲۴۹، ص:۳۸

(۱۳) سنن ابن ماجہ، المقدمہ، باب الوصاۃ بطلبۃ العلم، ح:۲۴۸، ص:۳۸

(۱۴) کنز العمال، ۲۴۳/۵

(۱۵) المسند، مسند عبداللہ بن عمروؓ، ح:۶۷۶۷، ۳۹۶/۲

(۱۶) صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب نسخ الماء من الماء وجوب الغسل.....، ح:۷۸۵، ص:۱۵۳

(۱۷) صحیح مسلم، کتاب الجمعۃ، باب تخفیف الصلوۃ والخطبۃ، ح: ۲۰۰۹، ص: ۳۴۸۔۳۴۹۔ المسند، حدیث عمار بن یاسر، ح:۱۷۸۵۳، ۳۲۶/۵

(۱۸) الموطأ، کتاب الحج، باب الصلوۃ فی البیت وقصر الصلوۃ وتعجیل الخطبہ بعرفۃ، ح:۴۲۲، ص:۲۶۶

(۱۹) تذکرۃ الحفاظ، تذکرہ عبداللہؓ بن مسعود، ۱۵/۱

(۲۰) خطیب بغدادی، ''کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ''، ص:۱۸۳، دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدر آباد، دکن، ۱۳۵۷ھ

(۲۱) المسند، حدیث زیدؓ بن ثابت، ح:۲۱۱۰۸، ۲۳۸/۶، اسد الغابہ، تذکرہ زیدؓ بن ثابت

(۲۲) سنن ابی داؤد، کتاب الطلاق، باب من احق بالولد، ح:۲۲۷۷، ص:۳۳۰

(۲۳) سرخسی، شمس الدین، ''المبسوط''، کتاب الصلوۃ، ۳۷/۱، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۹۷۸ء۔ محمد بن حسن الشیبانی، ''کتاب الاصل''، کتاب الصلوۃ، باب افتتاح الصلوۃ وما یصنع الامام، ۱۶/۱، دار المعارف النعمانیۃ، لاہور، ۱۹۸۱ء

(۲۴) حمید اللہ، ڈاکٹر، ''صحیفہ ہمام بن منبہ''، ناشر رشید اللہ یعقوب، کلفٹن، کراچی، ص۱۹۳، ۱۹۹۸ء

(۲۵) ابن سعد، ذکر بعثۃ رسول اللہ ﷺ الرسل بکتبہ الی الملوک.....۲۵۸/۱

(جاری)

کیا اسرائیل کو تسلیم کر لینا چاہیے؟

(۱)

علمائے دین کے حضور میں

○ جاوید چودھری ○

زاہد صاحب میرے دوست ہیں۔ انہوں نے میرے کالم ''تالاب میں کودنے سے پہلے'' کے جواب میں مجھے پروفیسر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے ایک لیکچر کی کاپی بھجوائی۔ پروفیسر صاحب اپریل ۱۹۹۲ء میں اس وقت کے وزیر اعظم نواز شریف کی دعوت پر دس روز کے لیے پاکستان تشریف لائے تھے۔ لاہور میں پائنا نے ان کے ایک خطاب کا اہتمام کیا۔ اس محفل میں عام شہریوں کے علاوہ ڈاکٹر اسرار احمد، ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک، ڈاکٹر صفدر محمود، مولانا صلاح الدین، چیف جسٹس انوار الحق، جسٹس محبوب احمد، ایس ایم ظفر، ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر رضاء الحق، پروفیسر جمیلہ شوکت، نذیر نیازی، اسماعیل قریشی، ڈاکٹر امین اللہ دشیر، ممتاز احمد خان، ڈاکٹر اقتدا حسن اور عبد الکریم عابد صاحب جیسے ممتاز عالم، دانش ور اور صحافی بھی موجود تھے۔ خطاب کے آخر میں جب سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک صاحب نے سورہ مائدہ کی آیت: یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی اَوْلِیَآءَ پڑھی اور پوچھا: ''ارشاد خداوندی ہے، یہودیوں کو دوست اور ولی نہ بناؤ۔ اس حکم کے حوالے سے یہ بھی ارشاد فرمائیں، اسرائیل کو تسلیم کرنے کے بارے میں آپ کا خیال کیا ہے؟'' پروفیسر صاحب نے اس سوال کے جواب میں فرمایا: (میں ان کے الفاظ یہاں لفظ بہ لفظ لکھ رہا ہوں) ''قرآن مجید میں ولی کا لفظ ہے، دوست کا نہیں، ..... جس کا مطلب میرے خیال میں یہ ہے کہ انہیں حاکم کے طور پر قبول نہیں کرنا چاہیے۔ اب رہی تعلقات قائم کرنے اور تسلیم کرنے کی بات تو یہ کسی قدر پیچیدہ مسئلہ ہے، اس معنی میں کہ اس معاملے کے کئی پہلو پیش نظر رکھنے ہوں گے اور فیصلہ فلسطینی مسلمانوں کی رائے پر ہونا چاہیے کیونکہ بنیادی طور پر یہ مسئلہ اہل فلسطین کا ہے۔ اگر وہ کسی مصلحت کی بنا پر یا کسی دوسرے فائدے کے پیش نظر یا قومی دشمن کی دشمنی کم کرنے کی کوشش کے طور پر اپنے موقف میں کچھ لچک پیدا کریں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ میرا

مشورہ اس بارے میں صرف اتنا ہے کہ جو بات ممکن اور قابل حصول ہو، وہ کریں۔ انہونی باتوں کا مطالبہ نہ کریں۔''

پروفیسر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا یہ خطاب ان کی رحلت کے بعد ایک معروف اردو ماہنامے کے فروری ۲۰۰۳ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ خطاب ادریس صدیقی کے قلم سے قارئین تک پہنچا۔ 'ولی' کی تشریح پر مبنی اقتباس اس کے صفحہ ۲۹ پر درج ہے۔ پروفیسر حمید اللہ صاحب اسلام کے جید عالم، مفکر اور دانش ور تھے۔ انہیں اردو اور انگریزی کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، فرانسیسی، جرمنی، ہندی اور اطالوی زبانوں پر بھی عبور تھا۔ انہوں نے قرآن مجید کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا، حیات رسول پر ترکی اور فرانسیسی میں کتب لکھیں۔ انہوں نے ایک سو بیس زبانوں میں قرآنی تراجم کی ایک ببلیو گرافی بھی مرتب کی۔ یہ انہی کی تحقیق ہے کہ آج دنیا کو معلوم ہے کہ اردو میں قرآن مجید کے تین سو، انگریزی میں ڈیڑھ سو اور فرانسیسی میں ستر ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے اردو میں ۱۲ اور انگریزی میں ۶ شاندار کتب تحریر کیں۔ ۱۹۴ ممالک میں آباد ایک ارب ۴۵ کروڑ مسلمانوں میں شاید ہی کوئی شخص ہو جو ان کے نام اور کام سے واقف نہ ہو۔ انہیں ۱۶۱ اسلامی ممالک میں وہ توقیر، وہ عزت حاصل ہے جو ایک جید عالم کو حاصل ہونی چاہیے۔ لہٰذا جب پروفیسر صاحب اپنے خطاب میں 'ولی' کو دوست کے بجائے حکمران قرار دیتے ہیں تو پھر سارا ''سیناریو'' ہی بدل جاتا ہے۔ مجھے اپنی کوتاہ علمی اور کم فہمی کا ادراک ہے۔ میں تو شاید قرآن مجید کے مفاہیم تک کبھی نہ پہنچ پاؤں، لہٰذا میں یہ آیت اور اس آیت میں درج ''اولیاء'' کے لفظ کو علمائے کرام کی بارگاہ میں پیش کرتا ہوں اور ان سے درخواست کرتا ہوں۔ معاملہ بہت ہی حساس اور علمی نوعیت کا ہے کیونکہ صرف ایک لفظ کی تشریح پر نہ صرف آئندہ پاکستان کی خارجہ پالیسی کی بنیاد رکھی جائے گی بلکہ عالم اسلام کے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ تعلقات بھی طے ہوں گے۔ چنانچہ علمائے دین آگے بڑھیں اور قوم کی مشکل آسان فرمائیں۔ ہم سب آپ کی رہنمائی چاہتے ہیں لیکن اتنا یاد رہے پروفیسر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اس پر کیا فرما چکے ہیں۔

معزز قارئین، میں نے کبھی یہ کالم عام بحث اور خطوط کے لیے عام نہیں کیا۔ میری کس تحریر، کس جسارت پر کیا کیا ردعمل ہوا، میں نے کبھی اس کا اظہار تک نہیں کیا۔ میں سمجھتا ہوں، انسان کو پوری ایمان داری سے اپنا فرض ادا کر دینا چاہیے اور اس کے بعد اس کا کیا ردعمل ہوتا ہے، اسے اس سے لاتعلق ہو جانا چاہیے لیکن میں پہلی بار اس کالم میں علمائے کرام کو سورۂ مائدہ کی یہود و نصاریٰ والی آیت پر اظہار خیال کی دعوت دیتا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ ہمارے وہ علمائے کرام جو ایسے قومی معاملات پر ہمیشہ چپ سادھ لیتے ہیں، وہ اس بار ضرور کوئی نہ کوئی واضح اور دوٹوک موقف اختیار کریں گے۔ آخر علمائے دین پر بھی اس ملک کو اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا فوج، بیوروکریسی، سیاست دانوں اور عوام پر حاصل ہے۔ اگر ہم سب اس ملک کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کے محافظ ہیں تو اس ملک کی فکری اور مذہبی سرحدوں

کی حفاظت علمائے کرام کا فرض ہے تو اے علمائے دین، فرض نبھانے کا وقت آن پہنچا ہے۔

(روزنامہ جنگ، لاہور۔۱۲ جولائی ۲۰۰۳ء)

(۲)

باسمہ سبحانہ

محترمی جاوید چودھری صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی؟

اسرائیل کے ساتھ تعلقات کے بارے میں ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ صاحب کے ارشاد کے حوالہ سے آپ کا کالم نظر سے گزرا۔ میری طالب علمانہ رائے میں ڈاکٹر صاحب علیہ الرحمۃ کا ارشاد بالکل بجا ہے کہ قرآن کریم کی جس آیت کریمہ میں یہود ونصاریٰ کے ساتھ ''ولایت'' کے درجہ کی دوستی سے منع کیا گیا ہے، وہ یہود ونصاریٰ کے ساتھ معمول کے تعلقات میں رکاوٹ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحی ممالک کے ساتھ تعلقات اور معاملات میں ملت اسلامیہ نے کبھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا اور خلافت راشدہ سے لے کر اب تک مسیحی ملکوں کے ساتھ ہمارے تعلقات اور معاملات برابر چلے آ رہے ہیں، البتہ یہودیوں کی ہزاروں سال بعد تشکیل پانے والی ریاست ''اسرائیل'' کے ساتھ تعلقات کا مسئلہ قدرے مختلف نوعیت کا ہے اور اس کی وجہ یہ آیت کریمہ نہیں بلکہ اگر اس آیت کریمہ کو اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات کی ممانعت میں پیش کیا جائے تو میرے خیال میں یہ خلط مبحث ہوگا اور مسئلہ کو زیادہ الجھا دینے کی صورت ہوگی۔

اسرائیل کو تسلیم کرنے اور اس کے ساتھ سفارتی تعلقات سے اختلاف کی وجوہ مختلف ہیں۔ مثلاً سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری وہاں کی صدیوں سے چلی آنے والی آبادی یعنی فلسطینیوں کی رضامندی کے ساتھ نہیں ہوئی بلکہ پہلے برطانیہ نے اس خطہ پر ۱۹۱۷ء میں باقاعدہ قبضہ کر کے فوجی طاقت کے بل پر یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیا ہے اور اب امریکہ پوری فوجی قوت استعمال کر کے فلسطینیوں کو یہودیوں کی اس جبری آبادکاری کو تسلیم کرنے پر مجبور کر رہا ہے جس پر فلسطینی راضی نہیں ہیں اور یہ دھونس اور جبر کا راستہ ہے جسے دنیا کی کوئی مہذب اور متمدن قوم قبول نہیں کر سکتی۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح ہم کشمیر کے بارے میں اصولی موقف رکھتے ہیں کہ بھارتی فوج وہاں سے چلی جائے اور کشمیریوں کو کسی دباؤ کے بغیر اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے، اسی طرح فلسطین بلکہ پورے مشرق وسطیٰ کے بارے میں ہمارا اصولی موقف یہ ہونا چاہیے کہ امریکہ اپنی فوجیں اس خطہ سے نکالے اور نہ صرف فلسطین بلکہ خلیج کے دیگر ممالک کو بھی فوجی دباؤ سے آزاد کر کے وہاں کے عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا

آزادانہ موقع فراہم کرے۔ انصاف اور مسلمہ اصولوں کا تقاضا تو بہرحال یہی ہے اور اگر بالادست قوتیں طاقت کے نشے میں اس اصول پر نہیں آتیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنے موقف سے دست بردار ہو جائیں اور بے اصولی اور دھونس کو اصول وقانون کے طور پر تسلیم کر لیں۔

پھر اسرائیل کو تسلیم کرنے میں ایک عملی رکاوٹ بھی ہے جسے دور کیے بغیر اسے تسلیم کرنا قطعی طور پر ناانصافی کی بات ہوگی۔ وہ یہ کہ اسرائیل کی سرحدی حدود اربعہ کیا ہے؟ یہ بات ابھی تک طے نہیں ہو سکی۔ بہت سے عرب ممالک اور فلسطینی عوام کی اکثریت سرے سے فلسطین کی تقسیم کو قبول نہیں کر رہی۔ اقوام متحدہ نے اسرائیل اور فلسطین کے درمیان جو سرحدات اپنی قراردادوں میں طے کر رکھی ہیں، انہیں اسرائیل تسلیم نہیں کر رہا۔ اسرائیل کی اقوام متحدہ کی طرف سے طے کردہ سرحدات اور ہیں، اس وقت اس کے زیر قبضہ علاقے کی حدود اربعہ اور ہیں، کسی اصول اور قانون کی پروا کیے بغیر پورے فلسطین میں دندناتے پھرنے سے اس کی سرحدوں کا نقشہ بالکل دوسرا دکھائی دیتا ہے اور اسرائیلی حکمرانوں کے عزائم پر مشتمل ''عظیم تر اسرائیل'' کا جو نقشہ ریکارڈ پر موجود ہے، وہ ان سب سے مختلف ہے۔ اس کے ساتھ اسرائیلی وزیر اعظم شیرون کا یہ اعلان کئی بار سامنے آ چکا ہے کہ وہ فلسطین کی مجوزہ ریاست کو صرف اس شرط پر تسلیم کریں گے کہ اس کی سرحدات کا تعین نہیں ہوگا اور اس کی الگ فوج نہیں ہوگی۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ اسرائیل پورے فلسطین پر حکمرانی کے حق کا اعلان کر رہا ہے اور فلسطینیوں کو سرحدات کے تعین کے ساتھ کوئی چھوٹی سی برائے نام ریاست دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔

اس کے ساتھ اسرائیل کو تسلیم کرنے سے قبل آپ کو ''بیت المقدس'' کے بارے میں بھی اپنے موقف پر نظر ثانی کرنی ہوگی اور اس کی دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو اسرائیل کو بیت المقدس سے دست برداری پر آمادہ کر لیں اور یا خود ''یو ٹرن'' لے کر ''بیت المقدس'' سے دست برداری کا فیصلہ کر لیں۔

یہ تینوں رکاوٹیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے، پریکٹیکل ہیں، عملی ہیں اور معروضی ہیں۔ ان کا کوئی باوقار اور قابل عمل حل نکال لیں اور بے شک اسرائیل کو ایک یہودی ریاست کے طور پر اسی طرح تسلیم کر لیں جس طرح ہم بہت سے مسیحی ممالک کو تسلیم کرتے آ رہے ہیں۔ میرے خیال میں اس حوالے سے بات عملی مسائل پر ہونی چاہیے اور معروضی حقائق پر ہونی چاہیے۔ نظری اور علمی مباحث میں الجھا کر اس مسئلہ کو مزید پیچیدہ نہیں بنانا چاہیے۔

شکریہ! والسلام

ابوعمار زاہد الراشدی

محمد عمار خان ناصر

ارض فلسطین پر یہود کا حق

صحف سماوی کی تصریحات اور عالم عرب کا حالیہ موقف

تورات کے بیانات

تورات میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے اہل وعیال سمیت اُور سے نکل کر کنعان کی طرف، جو فلسطین کا قدیم تاریخی نام ہے، ہجرت کرنے کا حکم دیا تو ان سے وعدہ کیا کہ وہ یہ سرزمین ان کی اولاد کو عطا کرے گا:

''اور خداوند نے ابرام سے کہا کہ تو اپنے وطن اور اپنے ناتے داروں کے بیچ سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل کر اس ملک میں جا جو میں تجھے دکھاؤں گا۔ اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا۔ ..... اور وہ ملک کنعان کو روانہ ہوئے اور ملک کنعان میں آئے۔ اور ابرام اس ملک میں سے گزرتا ہوا مقام سکم میں مورہ کے بلوط تک پہنچا۔ اس وقت ملک میں کنعانی رہتے تھے۔ تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا۔'' (پیدائش ۱۲: ۱۔ ۷)

تورات ہی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس موعودہ سرزمین کے حدود اربعہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتا دینے کے ساتھ ساتھ اس کے حصول کی الٰہی سکیم بھی ان پر واضح فرما دی تھی:

''اور اس نے ابرام سے کہا، یقین جان کہ تیری نسل کے لوگ ایسے ملک میں جو ان کا نہیں، پردیسی ہوں گے اور وہاں کے لوگوں کی غلامی کریں گے اور وہ چار سو برس تک ان کو دکھ دیں گے لیکن میں اس قوم کی عدالت کروں گا جس کی وہ غلامی کریں گے اور بعد میں وہ بڑی دولت لے کر وہاں سے نکل آئیں گے اور تو صحیح سلامت اپنے باپ دادا سے جا ملے گا اور نہایت پیری میں دفن ہوگا اور وہ چوتھی پشت میں یہاں لوٹ آئیں گے کیونکہ اموریوں کے گناہ اب تک پورے نہیں ہوئے۔ .... اسی روز خداوند نے ابرام سے عہد کیا اور فرمایا کہ یہ ملک دریائے مصر سے لے کر اس بڑے دریا یعنی دریائے فرات تک قینیوں اور قنیزیوں اور قدمونیوں اور حتیوں اور فرزیوں اور رفائیم اور اموریوں اور کنعانیوں اور جرجاسیوں اور یبوسیوں سمیت میں نے تیری اولاد کو دیا ہے۔'' (پیدائش ۱۵: ۱۳۔ ۲۱)

اس وعدے کی یاد دہانی حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کو بھی کرائی گئی۔[1] مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کی بادشاہت کے زمانے میں جب حضرت یعقوب علیہ السلام اپنی ساری اولاد کے ساتھ ہجرت کر کے وہاں تشریف لے گئے تو انہوں نے وصیت کی کہ انہیں مصر کے بجائے سرزمین کنعان ہی میں دفن کیا جائے۔[2] وفات کے وقت انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس الٰہی وعدے کی یاد دہانی کراتے ہوئے فرمایا:

''میں تو مرتا ہوں لیکن خدا تمہارے ساتھ ہوگا اور تم کو پھر تمہارے باپ دادا کے ملک میں لے جائے گا۔''

(پیدائش ۴۸: ۲۱)

مصریوں کی غلامی میں کئی صدیاں گزارنے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل میں مبعوث کیا تو انہیں بھی اس وعدے کی یاد دہانی کرائی۔[3] مصر سے خروج کے وقت حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو خدا کا یہ عہد یاد دلایا۔[4] بنی اسرائیل جب بیابان میں مقیم تھے تو خدا تعالیٰ نے انہیں شریعت عطا کی اور وہ منصوبہ بھی ان پر واضح فرمایا جس کے مطابق ارض موعودہ بنی اسرائیل کو عطا کی جانی تھی:

''میں اپنی ہیبت کو تیرے آگے آگے بھیجوں گا اور میں ان سب لوگوں کو جن کے پاس تو جائے گا، شکست دوں گا اور میں ایسا کروں گا کہ تیرے سب دشمن تیرے آگے اپنی پشت پھیر دیں گے۔ میں تیرے آگے زنبوروں کو بھیجوں گا جو حوی اور کنعانی اور حتی کو تیرے سامنے سے بھگا دیں گے۔ میں ان کو ایک ہی سال میں تیرے آگے سے دور نہیں کروں گا تا نہ ہو کہ زمین ویران ہو جائے اور جنگلی درندے زیادہ ہو کر تجھے ستانے لگیں بلکہ میں تھوڑا تھوڑا کر کے ان کو تیرے سامنے سے دور کرتا رہوں گا جب تک تو شمار میں بڑھ کر ملک کا وارث نہ ہو جائے۔ میں بحر قلزم سے لے کر فلستیوں کے سمندر تک اور بیابان سے لے کر نہر فرات تک تیری حدیں باندھوں گا کیونکہ میں اس ملک کے باشندوں کو تمہارے ہاتھ میں کر دوں گا اور تو ان کو اپنے آگے سے نکال دے گا۔'' (خروج ۲۳: ۲۷۔۳۱)

احکام شریعت کی تشریح اور اجتماعی زندگی کے حدود و قیود کی وضاحت کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا کہ وہ ارض موعودہ پر قبضے کے لیے بنی اسرائیل کو لے کر روانہ ہوں۔[5] موسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حکم کے مطابق بنی اسرائیل کے ہر قبیلے میں سے ایک ایک آدمی کو منتخب کیا اور انہیں ملک کنعان کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا۔ چالیس دن کے بعد جب وہ لوٹے تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو بتایا کہ:

''جس ملک میں تو نے ہم کو بھیجا تھا، ہم وہاں گئے اور واقعی دودھ اور شہد اس میں بہتا ہے اور یہ وہاں کا پھل ہے لیکن

---

[1] پیدائش ۲۶: ۲۔۳ و ۲۸: ۱۳۔

[2] پیدائش ۴۷: ۲۹۔۳۰

[3] خروج ۳: ۸۔۵: ۴

[4] خروج ۱۳: ۵

[5] خروج ۳۳: ۱

جولوگ وہاں بسے ہوئے ہیں، وہ زور آور ہیں اور ان کے شہر بڑے بڑے اور فصیل دار ہیں اور ہم نے بنی عناق کو بھی وہاں دیکھا۔ اس ملک کے جنوبی حصہ میں تو عمالیقی آباد ہیں اور حتی اور یبوسی اور اموری پہاڑوں پر رہتے ہیں اور سمندر کے ساحل پر اور یردن کے کنارے کنعانی بسے ہوئے ہیں۔'' (گنتی ۱۳: ۲۷۔۲۹)

بارہ کے گروہ میں سے کالب اور یشوع کے سوا باقی تمام افراد کنعان میں بسنے والی قوموں کی طاقت اور قوت سے سخت مرعوب تھے اور ان کی اس کیفیت کی وجہ سے بنی اسرائیل بھی من حیث المجموع ہمت ہار گئے اور ارض موعودہ پر حملہ کرنے سے انکار کر دیا:

''تب کالب نے موسیٰ کے سامنے لوگوں کو چپ کرایا اور کہا کہ چلو ہم ایک دم جا کر اس پر قبضہ کر لیں کیونکہ ہم اس قابل ہیں کہ اس پر تصرف کر لیں۔ لیکن جو اور آدمی اس کے ساتھ گئے تھے، وہ کہنے لگے کہ ہم اس لائق نہیں ہیں کہ ان لوگوں پر حملہ کریں کیونکہ وہ ہم سے زیادہ زور آور ہیں۔ ان آدمیوں نے بنی اسرائیل کو اس ملک کی جسے وہ دیکھنے گئے تھے، بری خبر دی اور یہ کہا کہ وہ ملک جس کا حال دریافت کرنے کو ہم اس میں سے گزرے، ایک ایسا ملک ہے جو اپنے باشندوں کو کھا جاتا ہے اور وہاں جتنے آدمی ہم نے دیکھے، وہ سب بڑے قد آور ہیں اور ہم نے وہاں بنی عناق کو بھی دیکھا جو جبار ہیں اور جباروں کی نسل سے ہیں اور ہم تو اپنی ہی نگاہ میں ایسے تھے جیسے ٹڈے ہوتے ہیں اور ایسے ہی ان کی نگاہ میں تھے۔ تب ساری جماعت زور زور سے چیخنے لگی اور وہ لوگ اس رات روتے ہی رہے اور کل بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون کی شکایت کرنے لگے اور ساری جماعت ان سے کہنے لگی، ہائے کاش ہم مصر ہی میں مر جاتے! یا کاش اس بیابان ہی میں مرتے! خداوند کیوں ہم کو اس ملک میں لے جا کر تلوار سے قتل کرانا چاہتا ہے؟ پھر تو ہماری بیویاں اور بال بچے لوٹ کا مال ٹھہریں گے۔ کیا ہمارے لیے بہتر نہ ہوگا کہ ہم مصر کو واپس چلے جائیں۔ پھر وہ آپس میں کہنے لگے آؤ ہم کسی کو اپنا سردار بنا لیں اور مصر کو لوٹ چلیں۔'' (گنتی ۱۳: ۲۷ تا ۳۳۔ ۱۴: ۱۔۴)

اس پست ہمتی اور بزدلی کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ سزا دی کہ:

''تمہاری لاشیں اسی بیابان میں پڑی رہیں گی اور تمہاری ساری تعداد میں سے یعنی بیس برس سے لے کر اس سے اوپر اوپر کی عمر کے تم سب جتنے گنے گئے اور مجھ پر شکایت کرتے رہے، ان میں سے کوئی اس ملک میں جس کی بابت میں نے قسم کھائی تھی کہ تم کو وہاں بساؤں گا، جانے نہ پائے گا سوا یفنہ کے بیٹے کالب کے اور نون کے بیٹے یشوع کے۔ اور تمہارے بال بچے جن کی بابت تم نے یہ کہا کہ وہ تو لوٹ کا مال ٹھہریں گے، ان کو میں وہاں پہنچاؤں گا اور جس ملک کو تم نے حقیر جانا، وہ اس کی حقیقت پہچانیں گے۔ اور تمہارا حال یہ ہوگا کہ تمہاری لاشیں اسی بیابان میں پڑی رہیں گی۔'' (گنتی ۱۴: ۲۹۔۳۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات تک بنی اسرائیل ارض موعود کے اردگرد بسنے والی مختلف اقوام سے لڑتے اور ان کے علاقوں پر قابض ہوتے رہے۔ وفات سے قبل موسیٰ علیہ السلام نے ارض موعود سے متعلق خدائی احکام و ہدایات تفصیل کے ساتھ بنی اسرائیل کو بتا دیے۔ ان میں سے اہم تر درج ذیل ہیں:

۱۔ موعودہ سرزمین کے حدود کی مفصل تعیین:

''پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ بنی اسرائیل کو حکم کر اور ان کو کہہ دے کہ جب تم ملک کنعان میں داخل ہو (یہ وہی ملک ہے جو تمہاری میراث ہوگا یعنی کنعان کا ملک مع اپنی حدود اربعہ کے) تو تمہاری جنوبی سمت دشت صین سے لے کر ملک ادوم کے کنارے کنارے ہو اور تمہاری جنوبی سرحد دریائے شور کے آخر سے شروع ہو کر مشرق کو جائے۔ وہاں سے تمہاری سرحد عقرابیم کی چڑھائی کے جنوب تک پہنچ کر مڑے اور صین سے ہوتی ہوئی قادس برنیع کے جنوب میں جا کر نکلے اور حصر ادار سے ہو کر عضمون تک پہنچے۔ پھر یہی سرحد عضمون سے ہو کر گھومتی ہوئی مصر کی نہر تک جائے اور سمندر کے ساحل پر ختم ہو۔ اور مغربی سمت میں بڑا سمندر اور اس کا ساحل ہو۔ سو یہی تمہاری مغربی سرحد ٹھہرے۔ اور شمالی سمت میں تم بڑے سمندر سے کوہ ہور تک اپنی حد رکھنا۔ پھر کوہ ہور سے حمات کے مدخل تک تم اس طرح اپنی حد مقرر کرنا کہ وہ صداد سے جا ملے۔ اور وہاں سے ہوتی ہوئی زفرون کو نکل جائے اور حصر عینان پر جا کر ختم ہو۔ یہ تمہاری شمالی سرحد ہو۔ اور تم اپنی مشرقی سرحد حصر عینان سے لے کر سفام تک باندھنا اور یہ سرحد سفام سے ربکہ تک جو عین کے مشرق میں ہے، جائے اور وہاں سے نیچے کو اترتی ہوئی کنرت کی جھیل کے مشرقی کنارے تک پہنچے۔ اور پھر یردن کے کنارے کنارے نیچے کو جا کر دریائے شور پر ختم ہو۔ ان حدود کے اندر تمہارا ملک ہوگا۔'' (گنتی ۳۴: ۱۔۱۲)

۲۔ وہاں بسنے والی اقوام کے مکمل اخراج کا حکم:

''بنی اسرائیل سے یہ کہہ دے کہ جب تم یردن کو عبور کر کے ملک کنعان میں داخل ہو تو تم اس ملک کے سب باشندوں کو وہاں سے نکال دینا اور ان کے شبیہ دار پتھروں کو اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ ڈالنا اور ان کے سب اونچے مقاموں کو مسمار کر دینا اور تم اس ملک پر قبضہ کر کے اس میں بسنا کیونکہ میں نے وہ ملک تم کو دیا ہے کہ تم اس کے مالک بنو..... لیکن اگر تم اس ملک کے باشندوں کو اپنے آگے سے دور نہ کرو تو جن کو تم باقی رہنے دو گے، وہ تمہاری آنکھوں میں خار اور تمہارے پہلوؤں میں کانٹے ہوں گے اور اس ملک میں جہاں تم بسو گے، تم کو دق کریں گے۔ اور آخر کو یوں ہوگا کہ جیسا میں نے ان کے ساتھ کرنے کا ارادہ کیا، ویسا ہی تم سے کروں گا۔'' (گنتی ۳۳: ۵۱۔۵۶)

۳۔ بارہ قبائل میں زمین کی تقسیم کا حکم:

''اور تم قرعہ ڈال کر اس ملک کو اپنے گھرانوں میں میراث کے طور پر بانٹ لینا۔ جس خاندان میں زیادہ آدمی ہوں، اس کو زیادہ اور جس میں تھوڑے ہوں، اس کو تھوڑی میراث دینا اور جس آدمی کا قرعہ جس جگہ کے لیے نکلے، وہی اس کو حصہ میں ملے۔ تم اپنے آبائی قبائل کے مطابق اپنی اپنی میراث لینا۔'' (گنتی ۳۴: ۵۴)

۴۔ وعدے کی مشروط نوعیت کی وضاحت:

''اور جب تجھ سے بیٹے اور پوتے پیدا ہوں اور تم کو اس ملک میں رہتے ہوئے ایک مدت ہو جائے اور تم بگڑ کر کسی چیز کی شبیہ کی کھودی ہوئی مورت بنا لو اور خداوند اپنے خدا کے حضور شرارت کر کے اسے غصہ دلاؤ تو میں آج کے دن تمہارے برخلاف آسمان اور زمین کو گواہ بناتا ہوں کہ تم اس ملک سے جس پر قبضہ کرنے کو یردن پار جانے پر ہو جلد

بالکل فنا ہو جاؤ گے۔ تم وہاں بہت دن رہنے نہ پاؤ گے بلکہ بالکل نابود کر دیے جاؤ گے اور خداوند تم کو قوموں میں تتر بتر کرے گا اور جن قوموں کے درمیان خداوند تم کو پہنچائے گا، ان میں تم تھوڑے سے رہ جاؤ گے۔ اور وہاں تم آدمیوں کے ہاتھ کے بنے ہوئے لکڑی اور پتھر کے دیوتاؤں کی عبادت کرو گے جو نہ دیکھتے نہ سنتے نہ کھاتے نہ سونگھتے ہیں لیکن وہاں بھی اگر تم خداوند اپنے خدا کے طالب ہو تو وہ تجھ کو مل جائے گا بشرطیکہ تو اپنے پورے دل سے اور اپنی ساری جان سے اسے ڈھونڈے۔ جب تو مصیبت میں پڑے گا اور یہ سب باتیں تجھ پر گزریں گی تو آخری دنوں میں تو خداوند اپنے خدا کی طرف پھرے گا اور اس کی مانے گا کیونکہ خداوند تیرا خدا رحیم خدا ہے۔ وہ تجھ کو نہ چھوڑے گا اور نہ ہلاک کرے گا اور نہ اس عہد کو بھولے گا جس کی قسم اس نے تیرے باپ دادا سے کھائی۔'' (استثنا ۴: ۲۵۔۳۱)

''اور جب یہ ساری باتیں یعنی برکت اور لعنت جن کو میں نے آج تیرے آگے رکھا ہے، تجھ پر آئیں اور تو ان قوموں کے بیچ جن میں خداوند تیرے خدا نے تجھ کو ہنکا کر پہنچا دیا ہو، ان کو یاد کرے اور تو اور تیری اولاد دونوں خداوند اپنے خدا کی طرف پھریں اور اس کی بات ان سب احکام کے مطابق جو میں آج تجھ کو دیتا ہوں، اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان سے مانیں تو خداوند تیرا خدا تیری اسیری کو پلٹ کر تجھ پر رحم کرے گا اور پھر کر تجھ کو سب قوموں میں سے جن میں خداوند تیرے خدا نے تجھ کو پراگندہ کیا ہو، جمع کرے گا۔ اگر تیرے آوارہ گرد دنیا کے انتہائی حصوں میں بھی ہوں تو وہاں سے بھی خداوند تیرا خدا تجھ کو جمع کر کے لے آئے گا اور خداوند تیرا خدا اسی ملک میں تجھ کو لائے گا جس پر تیرے باپ دادا نے قبضہ کیا تھا اور تو اس کو اپنے قبضہ میں لائے گا۔'' (استثنا ۳۰: ۱۔۵)

تورات کے ان بیانات سے واضح ہے کہ:

۱۔ فلسطین کی سرزمین اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بطور وراثت اور ملکیت عنایت کی تھی۔

۲۔ اس پر قبضے اور اس میں پہلے سے بسنے والی اقوام کے اخراج کے لیے ان کی جنگ حکم الٰہی کے ماتحت تھی۔

۳۔ بداعمالیوں کے نتیجے میں اس سرزمین سے بنی اسرائیل کی جلاوطنی ان کے تعلق کی تنسیخ کے طور پر نہیں بلکہ تنبیہ و توبیخ اور اصلاح احوال کا موقع فراہم کرنے کے لیے تھی۔

قرآن مجید کی تصریحات

جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے، تو وہ صراحتاً ان تمام بیانات کی تصدیق کرتا ہے، چنانچہ اس کی آیات سے حسب ذیل امور بالکل واضح ہیں:

☆ سرزمین فلسطین بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے 'وراثت' کے طور پر عطا کی گئی تھی اور اس میں ان کا آباد ہونا اللہ کے خاص فضل و احسان کا نتیجہ تھا:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ	اور ہم نے ان لوگوں کو جو کہ بالکل کمزور سمجھے جاتے تھے،
مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بَارَكْنَا	اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا وارث بنا دیا جس میں

فِيْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا (الاعراف،۱۳۷)

ہم نے برکت رکھی ہے۔ اور تیرے رب کا نیک وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر واستقامت کی وجہ سے پورا ہوگیا۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ (یونس،۹۳)

اور ہم نے بنی اسرائیل کو بہت اچھا ٹھکانا رہنے کو دیا اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق عطا کیا۔

☆ اس سرزمین پر قبضے کے لیے بنی اسرائیل کی جنگیں 'قتال فی سبیل اللہ' تھیں اور اس سے روگردانی ان کی بزدلی اور حکم عدولی کا مظہر تھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دور میں بنی اسرائیل کو اس حوالے سے جہاد کی جو ترغیب دی، اس کا ذکر قرآن مجید میں ان الفاظ میں ہے:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّآتٰكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ O يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ O(المائدہ،۲۰۔۲۱)

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اے میری قوم، اللہ کے اس احسان کو یاد کرو کہ اس نے تم میں سے پیغمبر بنائے اور تمہیں بادشاہ بنا دیا اور تمہیں وہ کچھ دیا جو تمام عالم میں کسی کو نہیں دیا۔ اے میری قوم، اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے نام لکھ دی ہے اور پشت پھیر کر روگردانی نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ پھر نقصان میں جا پڑو۔

جب بنی اسرائیل نے دشمنوں کے ساتھ لڑنے سے انکار کر دیا تو اس بزدلی کی پاداش میں اس سرزمین میں ان کا داخلہ چالیس سال کے لیے موخر کر دیا گیا:

قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَّتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَO(المائدہ،۲۶)

اللہ نے فرمایا کہ اب یہ سرزمین چالیس سال کے لیے ان پر حرام کر دی گئی ہے۔ یہ زمین میں سرگرداں ادھر ادھر پھرتے رہیں گے، اس لیے تم ان فاسقوں کے بارے میں غمگین نہ ہونا۔

یوشع بن نون علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل شہر کو فتح کر کے اس میں داخل تو ہو گئے لیکن اپنی ایمانی واخلاقی کمزوری کے باعث وہاں کی کافر قوموں کو پوری طرح نیست ونابود نہ کر سکے۔ ایک طویل عرصے کی پست ہمتی کے بعد سیدنا سموئیل علیہ السلام کے زمانے میں وہ ارض مقدسہ پر مکمل قبضہ کی غرض سے دوبارہ جہاد کے لیے آمادہ

ہوئے اور طالوت اور حضرت داؤد کی قیادت میں انہوں نے فلستی قوم کے ساتھ جنگ کی۔ سورہ بقرہ میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْ بَنِيْ اِسْرَآئِيْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَالَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآءِ نَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ O (البقرہ، ۲۴۶)

کیا آپ نے موسیٰ کے زمانے کے بعد بنی اسرائیل کی اس جماعت کا حال نہیں دیکھا جب انہوں نے اپنے پیغمبر سے کہا کہ کسی کو ہمارا بادشاہ بنا دیجیے تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ پیغمبر نے کہا کہ ممکن ہے جہاد فرض ہو جانے کے بعد تم جہاد نہ کرو۔ انہوں نے کہا، بھلا ہم اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہ کریں گے جبکہ ہم اپنے گھروں سے اجاڑے گئے اور بچوں سے دور کیے گئے ہیں؟ پھر جب ان پر جہاد فرض ہوا تو سوائے چند لوگوں کے باقی سب پھر گئے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ O فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَآتَاهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِيْنَ O (البقرہ، ۲۵۰، ۲۵۱)

اور جب ان کا جالوت اور اس کے لشکر سے آمنا سامنا ہوا تو انہوں نے دعا کی کہ یا اللہ، ہمیں صبر اور ثابت قدمی عنایت فرما اور کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے انہوں نے ان کو شکست دے دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے ان کو بادشاہت اور حکمت اور جتنا چاہا، علم بھی عطا کیا۔ اور اگر اللہ انسانوں (کے فتنہ وفساد) کو انسانوں ہی کے ذریعے سے دور نہ کرے تو زمین فساد سے بھر جائے لیکن اللہ دنیا والوں پر فضل کرنے والا ہے۔

☆ بنی اسرائیل پر اللہ کے احکام سے روگردانی کی صورت میں تعذیب اور جلاوطنی کا، جبکہ اصلاح احوال کی صورت میں اللہ کی رحمت کے دوبارہ متوجہ ہونے کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ

اور جب تمہارے رب نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ بنی

الْقِيَامَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْءَ الْعَذَابِ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَقَطَّعْنَاهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ وَبَلَوْنَاهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○ (الاعراف، ۱۶۷۔۱۶۸)

اسرائیل پر قیامت تک ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سخت عذاب چکھائیں گے۔ بلاشک تیرا جلدی سزا دینے والا ہے اور بے شبہ وہ بڑی مغفرت اور بڑی رحمت والا بھی ہے۔ اور ہم نے ان کو دنیا میں تتر بتر کر دیا۔ ان میں کچھ نیک تھے اور کچھ اس سے مختلف۔ اور ہم ان کو خوش حالی اور بد حالی سے آزماتے رہے تاکہ وہ باز آ جائیں۔

سورہ بنی اسرائیل میں فلسطین سے بنی اسرائیل کی دو مشہور جلاوطنیوں کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا ہے:

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يَّرْحَمَكُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِيْنَ حَصِيْرًا ○ (بنی اسرائیل: ۴ تا ۸)

توقع ہے کہ تمہارا رب تم پر پھر رحم کرے گا۔ لیکن اگر تم نے دوبارہ یہی رویہ اپنایا تو ہم بھی یہی کچھ کریں گے۔ اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیے قید خانہ بنا رکھا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ دوبارہ یاد دلاتے ہوئے فرمایا:

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ○ (البقرہ، ۴۰)

اے بنی اسرائیل، میرے ان احسانات کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیے اور میرے ساتھ کیا ہوا عہد پورا کرو، میں تمہارے ساتھ کیے ہوئے عہد کو پورا کروں گا اور بس مجھ ہی سے ڈرو۔

اس ضمن میں قرآن مجید نے یہ بات البتہ واضح فرما دی ہے کہ بنی اسرائیل کو اب قیامت تک پہلے کی طرح آزادی، استقلال اور خود مختاری حاصل نہیں ہوگی بلکہ وہ ہمیشہ سیدنا مسیح علیہ السلام پر ایمان رکھنے والوں کے تابع رہیں گے اور دنیا میں ان کو جب بھی اور جس قدر بھی راحت و اطمینان نصیب ہوگا، متبعین مسیح ہی کے زیر سایہ نصیب ہوگا:

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (آل عمران، ۵۵)

جب اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اے عیسیٰ، میں تجھے وفات دوں گا، اور تجھے اپنی جانب اٹھا لوں گا، اور تجھے ان کافروں کے شر سے نجات دوں گا اور تیرے تابع داروں کو قیامت تک تیرا انکار کرنے والوں پر غالب رکھوں گا۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ

(آل عمران، ۱۱۲)

ان پر ہر جگہ ذلت کی مار پڑی، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی یا لوگوں کی پناہ میں ہوں۔

امت مسلمہ کا حالیہ موقف

صحف آسمانی کی مذکورہ بالا تصریحات کی روشنی میں سرزمین فلسطین کے ساتھ یہود کے مذہبی وتاریخی تعلق اور اس بنیاد پر اس کے ساتھ ان کی قلبی وابستگی کی نوعیت بالکل واضح ہے، لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ صہیونی تحریک کے دعووں کے جواب میں امت مسلمہ اب قریب قریب اجتماعی طور پر اس بنیادی حقیقت سے ہی انکار کا راستہ اختیار کر چکی ہے کہ یہود اس سرزمین پر کبھی جائز طور پر قابض ہوئے تھے اور اس کے ساتھ ان کی وابستگی اور اس میں دوبارہ آباد ہونے کی خواہش کو مذہبی یا تاریخی لحاظ سے کوئی جائز بنیاد حاصل ہے۔ یہودی ریاست کے قیام کے لیے صہیونی کوششوں کے جواب میں امت مسلمہ کا استدلال اگر معروضی حالات کی ناموافقت تک محدود رہتا اور یہ کہا جاتا کہ زمینی حقائق کی روشنی میں اس قسم کی کسی ریاست کا قیام موجودہ عرب آبادی کی حق تلفی اور خطے میں سیاسی خلفشار اور کشمکش پیدا کیے بغیر ممکن نہیں تو اس موقف میں مذہبی یا اخلاقی لحاظ سے کوئی قباحت نہیں تھی، لیکن استدلال یہاں تک محدود نہیں رہا بلکہ مسئلے کا حل یہ ڈھونڈا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے ساتھ ارض مقدس کی وراثت کے خدائی وعدے کو ہی سرے سے لپیٹ دیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ فلسطین تو اصل میں صدیوں سے عربوں کا ملک ہے، یہودی تو درمیان میں محض ایک محدود عرصے کے لیے غاصبانہ طور پر اس پر قابض ہوئے تھے لیکن عربوں نے مزاحمت کر کے ان کو یہاں سے نکال باہر کیا، لہٰذا اس سرزمین پر کسی قسم کے تاریخی یا مذہبی حق کا یہودی دعویٰ ہی سرے سے بے بنیاد اور باطل ہے۔ عرب ممالک سرکاری سطح پر اس وقت یہی موقف اختیار کیے ہوئے ہیں۔ رابطہ عالم اسلامی کے سیکرٹری جنرل الدکتور عبداللہ بن صالح العبید نے اس کی ترجمانی یوں کی ہے:

> ''تاریخی دستاویزات کی رو سے القدس ایک خالص عربی شہر ہے جس کو تاریخ کے آغاز ہی سے نہایت اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کو کنعانیوں اور یبوسیوں نے آباد کیا تھا جو کہ عرب تھے۔..... قدیم تاریخ میں اگر القدس کو دوسری اقوام کے حملوں کا سامنا رہا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی ملکیت کا حق حملہ آوروں کو منتقل ہو گیا۔ یہ شہر قبل از اسلام تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف قوموں کی حرص وطمع کا نشانہ بنا رہا۔ اسرائیلی اس میں بارہویں صدی قبل مسیح میں داخل ہوئے۔ پھر ۵۸۶ ق م میں ایرانی اس پر حملہ آور ہوئے۔ ۳۳۲ میں اسکندر مقدونی نے اس پر قبضہ کر لیا جبکہ ۷۰ء میں یہ رومی عیسائیوں کے زیر تسلط آ گیا۔ لیکن اس کے عرب باسی ہر مرتبہ حملہ آوروں کو نکال باہر کرتے رہے تاکہ یہ شہر ایک خالص عربی شہر ہی رہے۔ .....اس زمانے میں یہودیوں کا یہ دعویٰ کہ القدس ایک عبرانی شہر ہے، ان تاریخی دستاویزات کو نظر انداز کرنے پر مبنی ہے جو ثابت کرتی ہیں کہ القدس کا ایک شہر کے طور پر ظہور برونزی عہد

کے آغاز میں ہوا جب کنعانیوں نے اس کی تعمیر کی۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آثار قدیمہ کے انکشافات اور تاریخی مآخذ کے مطابق فلسطین میں عربوں کی تاریخ چھ ہزار سال پرانی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں عربوں کا وجود اسرائیلیوں کے حملے سے ۲۶۰۰ سال مقدم ہے۔ اس سے وہ تمام یہودی دعوے خاک میں مل جاتے ہیں جن کے مطابق القدس اور فلسطین یہود کی ملکیت ہیں حالانکہ قدیم تاریخ میں القدس پر یہودیوں کی حکومت مسلسل ۷۰ سال سے زیادہ کبھی نہیں رہی۔'' (ہفت روزہ ''العالم الاسلامی''، ملحق خاص، ۱۵ تا ۲۱ فروری ۱۹۹۹ء، ص ۳)

اس موقف کو بعض جید علماء دین اور مفتیان شرع متین نے بھی پذیرائی بخشی ہے۔ دنیائے عرب کے نامور عالم الشیخ یوسف القرضاوی فرماتے ہیں:

''اگر ان تمام سالوں کو جمع کیا جائے جو یہودیوں نے حملے کرتے اور تباہی پھیلاتے ہوئے فلسطین میں گزارے تو اتنی مدت بھی نہیں بنے گی جتنی انگریز نے ہندوستان میں یا ہالینڈیوں نے انڈونیشیا میں گزاری۔ اگر اتنی مدت گزارنے پر کسی کو کسی سرزمین پر تاریخی حق حاصل ہو جاتا ہے تو انگریزوں اور ہالینڈیوں کو بھی اس قسم کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ اور اگر غربت کی حالت میں ایک طویل عرصہ کسی علاقے میں گزارنے سے اس زمین پر ملکیت کا حق ثابت ہوتا ہے تو پھر یہودیوں کو چاہیے کہ وہ فلسطین کے بجائے، جس میں ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد نے تقریباً ۲۰۰ سال گزارے اور جہاں وہ دو افراد آئے تھے لیکن ۷۰ افراد نکل کر گئے، مصر کی ملکیت کا مطالبہ کریں جس میں انہوں نے ۴۳۰ سال گزارے۔..... یہودیوں کا فلسطین پر تاریخی حق کا دعویٰ بالکل بکواس ہے۔ صحیفوں کی تصریح کے مطابق وہ یہاں محض اجنبیوں کی طرح رہے۔ تو کیا کسی پردیسی یا راہ گیر کو یہ حق ہے کہ وہ اس زمین پر جس نے اس کو ذرا پناہ دے دی یا اس درخت پر جس نے اس کو تھوڑی دیر سایہ فراہم کر دیا، اس وجہ سے ملکیت کا حق جتا دے کہ اس نے گھڑی کی گھڑی وہاں سستا لیا ہے؟'' (ہفت روزہ الدعوۃ، الریاض، ۱۱ اپریل ۲۰۰۲ء، ص ۳۶)

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے فیصلے عادلانہ ہوتے ہیں اور جس نے ظلم کو اپنے اوپر اور اپنے بندوں پر حرام قرار دیا ہے، کوئی سرزمین جس پر اس کے مالک جائز طریقے سے مسلسل قابض چلے آ رہے ہوں، ایک ایسے پردیسی گروہ کو عنایت کر دے جو وہاں باہر سے گھس آیا ہو؟ اللہ کا عدل و انصاف کہاں گیا؟ وہ تو انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔'' (ص ۳۹)

عالم اسلام کے اکابر و اصاغر اہل علم کے بیانات اور تحریروں میں جا بجا اسی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اقبالؒ نے اسی استدلال کی ترجمانی اپنے مشہور شعر میں یوں کی ہے:

ہے خاک فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر کیوں نہیں حق اہل عرب کا

ان میں مولانا مودودیؒ کا معاملہ عجیب تر ہے۔ ارض موعودہ سے متعلق قرآن مجید کے نصوص کی تفسیر کرتے ہوئے

تو، ظاہر ہے، وہ اس تاریخی حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکے، چنانچہ مثلاً سورۂ مائدہ کی آیت ۲۱ کے الفاظ 'الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ' کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس سے مراد فلسطین کی سرزمین ہے جو حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کا مسکن رہ چکی تھی۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکل آئے تو اسی سرزمین کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے نامزد فرمایا اور حکم دیا کہ جا کر اسے فتح کر لو۔'' (تفہیم القرآن ۴۵۹/۱)

سورہ بقرہ کی آیت ۲۴۳ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''یہ لوگ بہت بڑی تعداد میں مصر سے نکلے تھے۔ دشت و بیاباں میں بے خانماں پھر رہے تھے۔ خود ایک ٹھکانے کے لیے بے تاب تھے۔ مگر جب اللہ کے ایما سے حضرت موسیٰ نے ان کو حکم دیا کہ ظالم کنعانیوں کو ارض فلسطین سے نکال دو اور اس علاقے کو فتح کر لو تو انہوں نے بزدلی دکھائی اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔'' (۱۸۴/۱)

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۵ کے تحت فرماتے ہیں:

''حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل فلسطین میں داخل ہوئے تو یہاں مختلف قومیں آباد تھیں۔ حتی، اموری، کنعانی، فرزی، حوی، یبوسی، فلستی وغیرہ۔ ان قوموں میں بدترین قسم کا شرک پایا جاتا تھا۔..... توراۃ میں حضرت موسیٰ کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو جو ہدایات دی گئی تھیں، ان میں صاف صاف کہہ دیا گیا تھا کہ تم ان قوموں کو ہلاک کر کے ان کے قبضے سے فلسطین کی سرزمین چھین لینا اور ان کے ساتھ رہنے بسنے اور ان کی اخلاقی و اعتقادی خرابیوں میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرنا۔'' (۵۹۶/۲)

لیکن صہیونی تحریک کے دعووں اور عزائم کی تردید کرتے وقت یہ نصوص ان کی نگاہ سے بالکل اوجھل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''بیت المقدس اور فلسطین کے متعلق آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تقریباً تیرہ سو برس قبل مسیح میں بنی اسرائیل اس علاقے میں داخل ہوئے تھے اور دو صدیوں کی مسلسل کشمکش کے بعد بالآخر اس پر قابض ہو گئے تھے۔ وہ اس سرزمین کے اصل باشندے نہیں تھے۔ قدیم باشندے دوسرے لوگ تھے جن کے قبائل اور اقوام کے نام خود بائبل میں تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور بائبل ہی کی تصریحات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ان قوموں کا قتل عام کر کے اس سرزمین پر اسی طرح قبضہ کیا تھا جس طرح فرنگیوں نے سرخ ہندیوں (Red Indians) کو فنا کر کے امریکہ پر قبضہ کیا۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ خدا نے یہ ملک ان کی میراث میں دے دیا ہے اس لیے انہیں حق پہنچتا ہے کہ اس کے اصل باشندوں کو بے دخل کر کے بلکہ ان کی نسل کو مٹا کر اس پر قابض ہو جائیں۔.....

اس تاریخ سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ:

۱۔ یہودی ابتداءً نسل کشی (Genocide) کے مرتکب ہو کر فلسطین پر زبردستی قابض ہوئے تھے۔

۲۔ شمالی فلسطین میں صرف چار پانچ سو برس تک وہ آباد رہے۔

۳۔جنوبی فلسطین میں ان کے قیام کی مدت زیادہ سے زیادہ آٹھ نو سو برس رہی۔اور
۴۔عرب شمالی فلسطین میں ڈھائی ہزار سال سے اور جنوبی فلسطین میں تقریباً دو ہزار سال سے آباد چلے آ رہے ہیں۔
لیکن اس کے باوجود یہودیوں کا آج بھی یہ دعویٰ ہے کہ فلسطین ان کے باپ دادا کی میراث ہے جو خدا نے انہیں عطا فرمائی ہے اور انہیں حق پہنچتا ہے کہ اس میراث کو بزور حاصل کر کے اس علاقے کے قدیم باشندوں کو اسی طرح نکال باہر کریں اور خود ان کی جگہ بس جائیں جس طرح تیرہ سو برس قبل مسیح میں انہوں نے کیا تھا۔''

(سانحہ مسجد اقصیٰ، ص ۳۔۵)

اب ذرا ملاحظہ کیجیے کہ صحف آسمانی کی تصریحات اور امت مسلمہ کے موقف کے مابین 'تفاوت رہ' کس قدر ہے:

۱۔صحف آسمانی ارض فلسطین کو خدا کی طرف سے یہود کو عطا کردہ میراث قرار دیتے ہیں جبکہ ہمارے اہل علم ان کو اس سرزمین میں پردیسی اور اجنبی کہتے اور اس میں ان کے قیام کو صدیوں اور سالوں کے پیمانوں سے ناپ کر اس حق کو خرافات قرار دیتے ہیں۔

۲۔صحف آسمانی اس سرزمین پر قبضے کے لیے بنی اسرائیل کی جنگ کو 'قتال فی سبیل اللہ' قرار دیتے ہیں جو بنی اسرائیل نے سیدنا موسیٰ، سیدنا یوشع اور سیدنا داؤد علیہم السلام جیسے جلیل القدر انبیا کی زیر قیادت کیا، جبکہ ہمارے اہل علم نے اس ساری جدوجہد کے لیے 'نسل کشی' کا عنوان تجویز کیا ہے۔

۳۔صحف آسمانی فلسطین کے سابق باسیوں یعنی کنعانیوں، فلستیوں اور دیگر اقوام کے وہاں سے اخراج کو ان کے جرائم کی پاداش اور فساد فی الارض کی سزا بتاتے ہیں لیکن ہمارے اہل علم کے لیے یہ بات ناقابل فہم ہے کہ خدا ایک سرزمین میں جائز طور پر بسنے والی قوم کو نکال کر ایک اجنبی قوم کو وہاں آباد ہونے کا حق کیسے دے سکتا ہے۔

۴۔صحف آسمانی کے مطابق یہود کی اس سرزمین سے جلاوطنی ان کی بداعمالی کے نتیجے میں ہے اور اصلاح احوال کی صورت میں ان کی وہاں واپسی کا راستہ کھلا ہوا ہے لیکن ہمارے اہل علم کے نزدیک ان کی واپسی کی کسی حال میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آج ہمارے مابین اس بات کا تذکرہ تو عام ہے کہ یہود ایک مغضوب علیہ قوم ہیں اور ان کی ذلت و رسوائی ان پر خدا کی طرف سے مسلط کردہ ہے، لیکن ہم اس پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ ان پر اللہ کا غضب اسی طرح کے کتمان حق، مذہبی و نسلی تعصب اور تکذیب آیات اللہ کے نتیجے میں نازل ہوا تھا جس کا مظاہرہ آج بعض معاملات، خاص طور سے یہود سے متعلق معاملات میں امت مسلمہ کر رہی ہے۔ جہاں تک اللہ کی رحمت اور اس کی ناراضی کے قانون کا تعلق ہے، قرآن مجید کی رو سے وہ امت مسلمہ کے لیے بھی وہی ہے جو بنی اسرائیل کے لیے تھا: ولن تجد لسنة الله تبديلا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس طرح کا غیر اخلاقی رویہ اختیار کرنے پر بنی اسرائیل پر تو اللہ تعالیٰ کی طرف ذلت و مسکنت مسلط کی جائے لیکن امت مسلمہ کو بدستور عروج اور سرفرازی کے منصب پر فائز رکھا جائے؟

مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کی

سالانہ تقریبِ ختمِ بخاری شریف

وجلسۂ تقسیمِ اسناد و دستارِ فضیلت

☆ مقرّرین ☆

O مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ (اکوڑہ خٹک) O مولانا علامہ علی شیر حیدری (سندھ)

O مولانا حافظ حسین احمد ایم این اے (کوئٹہ) O مولانا زاہد الراشدی (گوجرانوالہ)

O مولانا قاری عبد الغفور حقانی (شجاع آباد) O مولانا محمد امجد خان (لاہور)

O نعت خواں: قاری محمد حنیف شاہد رام پوری (گولڈ میڈلسٹ)

دورۂ حدیث، حفظِ قرآن اور تجوید سے فراغت حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات
کی دستار بندی ہوگی۔ خواتین کے لیے باپردہ شرکت کا انتظام ہے۔

من جانب: محمد فیاض خان سواتی (مہتمم) مدرسہ نصرت العلوم، فاروق گنج، گوجرانوالہ

فون: 745215 - 218530 - 0333 8113702